قیمت : -/10 روپے

دسمبر 2008

اردو دنیا

نئی دہلی

79 ویں سالگرہ مبارک

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
Pakistan	Rs. 192	480
Nepal	Rs. 300	588
BanglaDesh	Rs. 132	420
Rest of World	Rs. 300	684

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

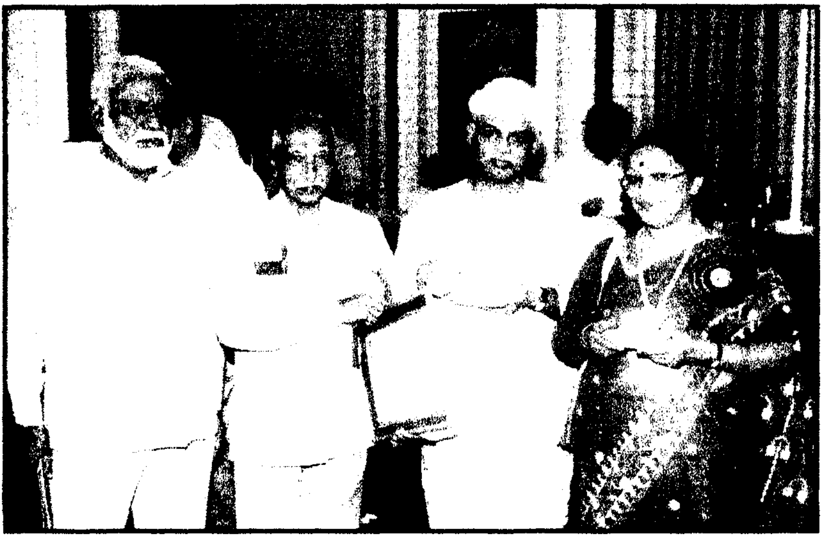

پچھلے دنوں جناب محی الدین بمبئی والا کو فارسی زبان و ادب میں ان کی خدمات کے لیے صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے ایوارڈ عطا کیا گیا۔ تصویر میں دائیں سے محترمہ ریتا چٹرجی، ڈائرکٹر لنگویجز، ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، جناب محی الدین بمبئی والا اور پروفیسر انصاری۔

کونسل کی ایک ادبی تقریب میں دائیں سے: پروفیسر شمیم حنفی، سید شاہد مہدی وائس چیئر مین آئی سی سی آر اور ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی اردو کونسل۔

ماہنامہ
اردو دنیا نئی دہلی
جلد۔10، شمارہ۔12، دسمبر 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 4

زبان اور تعلیم
● جدید ترقیاتی منظر نامہ اور اردو .... محمد احسن 5
● لسانی مطالعے کی اہمیت .... درخشاں زریں 8
● فاصلاتی تدریس وتعلیم کا تاریخی پس منظر .... امتیاز وحید 12

صحافت اور سماج
● دہشت پسندی کا مقابلہ .... اصغر علی انجینئر 15
● بہار کے اولین اردو اخبارات .... سید احمد قادری 18
● آل انڈیا ریڈیو کی اردو خدمات .... مظفر علی 22

شخصیات
● پنڈت جواہر لعل نہرو— نئے ہندوستان کے معمار .... عبدالباری 25
● مولانا آزاد اور اردو یونیورسٹی .... وہاب قیصر 26

ماحولیات اور صحت
● ہندوستان میں جنگلات کی اہمیت .... فہیم احمد 29
● ایڈز— ایک مہلک عارضہ .... شمیم احمد صدیقی 31

کیریئر
● پرائیویٹ سیکٹر میں کیریئر کے امکانات .... فاروق احمد درویش پوری 34
● فرضی اداروں سے کیسے بچیں .... محمد اعجاز 36

روبرو
● احمد یوسف سے آخری گفتگو .... نسیم احمد نسیم 39

ہماری مطبوعات سے
● کلیات آغا حشر کاشمیری (دیباچہ) .... مرتبین 41

اردو خبرنامہ .... ادارہ 46

تبصرہ وتعارف
● حیات جاوید .... شاہد الاسلام 66
● جدید— ہندی اردو لغت .... احمد کفیل ....
● کلیات اسعد بدایونی .... نجمہ رحمانی ....
● کلیات نگارشات وخطبات بابا بھیم راؤ امبیڈکر .... عابد سہیل ....
● مکتوبات ساغر نظامی .... ممتاز الحق ....
● میری گفتگو تجھ سے .... عبدالاحد ساز ....
● اردو غزل انیسویں صدی کے تناظر میں .... خسرو متین ....

بچوں کا گوشہ
● یہیں مجھ کو جینا ہے .... عبدالرحیم نشتر 73
● بکتر بند جانور .... قیصر سرمست 74

آپ کی بات

■ **رفعت سروش، 204 صبا اپارٹمنٹ، ڈی-3، سیکٹر-44، نوئیڈا**

کل شام "اردو دنیا" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے اس رسالے کو آہستہ آہستہ اعلیٰ قسم کا ادبی پرچہ بنادیا۔ حالانکہ شروع شروع میں یہ بالکل خبرنامہ قسم کا پرچہ تھا۔ اس میں آپ کے حسن تنظیم اور سوجھ بوجھ کے علاوہ "تخلیقی صحافت" کے جوہر کو بھی دخل ہے اور اس جوہر کو آپ نے اپنی روح و دل میں پال کر جوان کیا ہے۔ بہت خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ حبیب تنویر پر بہت خوبصورت مضمون شائع کیا ہے اور رالف رسل کا گوشہ تو قابلِ قدر ہے ہی۔ بیگ احساس کا مضمون بھی اچھا تھا۔

میں کئی ماہ بعد اب ذرا اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کررہا ہوں۔ کچھ لگ کر علاج کرنے کا نتیجہ، کچھ موسم کی تبدیلی اور سب سے زیادہ رحمتِ خداوندی۔ اب طبیعت ٹھیک ہے، مگر احتیاط سے کام لے رہا ہوں۔ تبصرے بھی آپ کے قلم سے اور دوستوں کے قلم سے خوب شائع ہو رہے ہیں:

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

میں نے بڑا پیسہ لگا کر بہت ارمانوں سے "کلیات اوپیرا ڈرامے۔۔۔جہان رقص و نغمہ" شائع کی تھی اور آپ نے بہت محبت سے اس کے اجرا کے جلسے کی نظامت فرمائی تھی۔ پھر اس کا ایک جلسہ حبیب تنویر کی صدارت میں بھوپال میں بھی ہوا مگر اس پر تبصروں کا فقدان ہے۔ اس میں میری علالت کو بھی دخل ہے۔

ہمارے اردو کے اہلِ قلم کی بدنصیبی یہ ہے کہ تخلیقی کام کرو، اسے لیے لیے پھرو، رسالے والوں کی چاپلوسی کرو، بھائی دو لفظ تبصرے کے چھاپ دو اور پھر سب کو کتاب مفت بھیجو کہ اگر وہ پڑھنے کی زحمت گوارا کرلیں تو ان کا شکریہ۔

میاں! کیا اور ملا ہے ہم کو۔

اب یہ مجھ جیسے لوگوں کا پاگل پن بھی ہے اور مجبوری بھی کہ ہر وقت اسی قلم کاری میں لگے رہتے ہیں۔ شاید زندگی کے دوسرے راستے ہم جیسے لوگوں کے لیے مسدود ہوگئے ہیں۔ گھسٹتے گھسٹتے عمر کی پچاسویں منزل آگئی۔ ساٹھ سے زائد کتابوں کا پشتارہ مگر ہمارا ادبی معاشرہ ہے کہ بس توبہ بھلی۔ بیمار پڑ جائیے تو کوئی پرسان حال نہیں۔ لکھیے تو لوگوں کو شکایت کہ فلاں تو بہت لکھتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ بوتے کب ہیں اور کاٹتے کب ہیں۔

■ **ڈاکٹر ایس. اخلاق حسین اثر، چوکی امام باڑہ، بھوپال-462001**

نومبر کے شمارے میں گوشہ "رالف رسل" پسند آیا جو نہایت مفید اور معلوماتی ہے۔ پروفیسر بیگ احساس اور ذاکر فیضی صاحبان کے مضامین میں ندرت ہے۔ رالف رسل صاحب کے رائج نام اور تلفظ کے بارے میں مجھے شک تھا چنانچہ میں نے ان سے استفسار کیا تھا۔ جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ "ریلف" زیادہ صحیح ہے۔ "ریلف" میں "ریئے" کا تلفظ "عید" کے "عین" کے مطابق ہے۔ اردو والے ان کو رالف رسل لکھتے تھے اس لیے انھوں نے اس کو اختیار کرلیا تھا۔

حبیب تنویر پر حبیب احمد کا مضمون محنت سے لکھا گیا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ڈرامے کی بنیادی زبان ایک ہی ہوتی ہے دو نہیں۔ "کامدیو کا اپنا بسنت رتو کا سپنا" کی زبان اردو ہوگی یا چھتیس گڑھی۔ ڈرامے کے کردار اپنی اپنی زبان بولتے ہیں۔ حبیب تنویر نے اپنے تین ڈراموں کی شیلی کو اپنی پہچان کہا ہے۔ پرتھوی تھیٹر کی مشہور شخصیت سنجنا کپور جنھوں نے حبیب تنویر پر سماروہ کا پروگرام بنایا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ "حبیب جی نے تھیٹر میں کسی شیلی کو نہیں لیا بلکہ لوک کلاکاروں کو لیا ہے۔" انھوں نے یہ خیال ظاہر کرکے بامعنی بحث کا آغاز کیا ہے۔

■ **ایم اے گھوراڈی، ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا-480001 مدھیہ پردیش**

اردو ادب کے شیدائی رالف رسل کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اکتوبر کے شمارے میں ایک گوشہ مرحوم شاعر احمد فراز کے نام کرنے کے لیے آپ کا شکریہ۔ مضمون نگار وارث علوی، مظہر امام، فضیل جعفری، لطف الرحمٰن، صادق، چندر بھان خیالی اور سید امتیاز الدین بھی نے فراز کے بارے میں بہت اچھا لکھا ہے۔ اس میں اختلاف رائے نہیں کہ احمد فراز اپنے وقت کے مقبول ترین شاعروں میں تھے۔ ان کے کلام میں شگفتگی کی کیفیت ہے۔ ان کے طرز اظہار میں کوئی بناوٹ نہیں، ان کے لہجے میں ایک نزاکت ہے۔

منشی پریم چند کے یوم وفات پر پردیپ جین صاحب کا تحفہ پسند آیا۔ پریم چند کی تخلیقات میں کوئی اشارہ موجود نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ احساسات سے متاثر تھے۔ ابوبکر عباد کے مضمون "رومان پسند انقلابی نقاد" سے جانا کہ جناب سجاد حیدر نے اردو زبان میں ادب لطیف اور نثری شاعری کی راہیں ہموار کیں، اپنے افسانوں میں ترقی پسند سیاسی اور سماجی شعور کو جگہ دی، پردے کی مخالفت اور تعلیم نسواں کی حمایت کی۔

"ماں کی گود سے قبر تک علم حاصل کرو" تعلیم کے متعلق پیغمبر حضرت محمدؐ نے جو ہدایتیں دی ہیں ان پر سنجیدگی سے عمل ہونا چاہیے۔

اعجاز احمد صاحب نے بتایا کہ ہندوستان آؤٹ سورسنگ میں عالمی سطح پر نمبرون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کو اپنی بادشاہت برقرار رکھنے کے لیے کم خرچ پر بجلی مہیا کرانی ہوگی۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی سے پوری دنیا عالمی گاؤں میں

تبدیل ہوگئی ہے یہ جان کر اچھا لگا کہ اب "اردو آن لائن صحافت" کو وسعت دینے کے لیے "ورلڈ وائڈ ویب" پر سارے مواقع ہمارے منتظر ہیں۔ سید الفت حسین نے "نیٹ اردو کی تیاری کیسے کریں" میں مفید ہدایتیں دی ہیں۔ محمد حسن صاحب کے مضمون سے افلاطون کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں جیسے افلاطون کو فن اور شاعری کا سب سے سنگ دل نقاد کہا جاتا ہے اس کے باوجود جس قدر شاعرانہ انداز بیان افلاطون کے "مکالمات" میں ملتا ہے اتنا کسی اور فلسفی کی تصنیف میں نہیں ملتا۔ افلاطون فن کی سماجی حیثیت پر غور کرتا ہے۔ شعروفن، مصوری اور سنگیت عقل کے بجائے جذبات سے اپیل کرتے ہیں۔ فن کار کے بیانات حقیقی نہیں ہوتے، وہ کسی جنون کے زیر اثر یہ باتیں کہتا ہے اور اس کے لیے ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ افلاطون نے فن اور خاص طور پر شاعری کو "نقل کی نقل" کہا ہے۔

تبصرہ اور تعارف سے تنقیدی سرمائے میں اضافہ ہورہا ہے۔ بدر متین کی کہانی "سنہرا انس" اور قمر غزالہ کی کہانی "کلی مرغا اور سمبو بھیڑیا" بہت پسند آئی۔

■ ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج کالج، نظام آباد

"اردو دنیا" کا ہر شمارہ اردو والوں کو عصری شعور و آگہی عطا کرتا ہے۔ اکتوبر 2008 کا شمارہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں احمد فراز پر ایک گوشہ شامل کیا گیا ہے۔ احمد فراز کے تعلق سے اداریے میں فکر انگیز باتیں بیان کی گئی ہیں۔ احمد فراز ایک حساس شاعر تھے۔ ان کا شعری رویہ تخلیقی تھا۔ تقلید اور نقل سے کوسوں دور وہ غزل اور نظم کے بہترین تخلیق کار ہیں۔ زندگی اور زمانے کی باتوں کو موثر انداز سے بیان کیا ہے۔ اس شمارے میں اردو کے معروف نقادوں اور ادیبوں نے ان کی شخصیت اور شاعری پر بھرپور تنقیدی اور تجزیاتی نظر ڈالی ہے۔ ان کے معترضین بہت ہیں اور اعتراض ہوتے رہیں گے۔ ان کی شاعری ہمیشہ دلوں کو اپیل کرتی رہے گی۔ لیکن آپ کی بات کالم بہت خوب ہے۔ اس کالم میں کسی ادبی بحث کو جگہ دیں۔ دیگر مشمولات بھی جامع اور بصیرت افروز ہیں۔

■ شہاب اختر، کلکتہ کلاتھ اسٹورس، کمڑا اپی، جھریا-828111

احمد فراز کی شاعری اردو شاعری میں اضافی صورت ہے۔ ان کی شاعری ایک چھلکتی ہوئی محبت کرتی ہوئی عشق میں جھیل بنتی ہوئی شاعری ہے۔ ادب میں مقام وقت طے کرتا ہے۔ فضیل جعفری کا مضمون پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بغض وعداوت میں یہ تحریر کیا ہے۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احمد فراز کی شاعری کھوکھلی، سطحی اور کمزور شاعری ہے۔ لوگوں نے اسی طرح سے ساحر لدھیانوی کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ "اردو دنیا" کے اس شمارے میں وارث علوی، مظہر امام اور فضیل جعفری کے مضامین احمد فراز کی شاعری پر سوالیہ نشان بناتے ہیں۔ ان لوگوں نے ایمانداری نہیں برتی اور قارئین کے ذہن میں احمد فراز کی شاعری کو مشکوک کردیا۔ میرا اپنا یہ ماننا ہے کہ احمد فراز کی شاعری عشق و دل کی شاعری ہے۔ یہ آنکھوں میں چمک پیدا کرتی ہے دل کو قرار دیتی ہے۔ آخر میں سب سے اہم نکتہ احمد فراز کی شاعری فیض کی شاعری نہیں ہے۔ یہ شاعری اس سے بڑی ہے اور آگے کی ہے۔ احمد فراز کے اشعار زندہ رہیں گے۔

■ مریم انصاری، 13، قومی کنزیومرس، سوسائٹی کی چال، رکھیال روڈ، احمد آباد-380023

"اردو دنیا" دن بدن نکھرتا جارہا ہے، ادبی نگارشات کے اضافے نے پرچے کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں احمد فراز کا گوشہ لائق تحسین ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کا مقالہ احمد فراز کی شعریات پر ایک پُر مغز مضمون ہے۔ فضیل جعفری کا مضمون "احمد فراز اور ان کی شاعری: جیسا کہ میں سمجھتا ہوں" قابل غور ہے۔ "اردو دنیا" میں "گوشۂ احمد فراز" کی اشاعت کا مقصد انھیں خراج عقیدت پیش کرنا تھا۔ نہ یہ کہ ان کے شخصی اور فنی عیوب کی نشان دہی کرکے دل کی بھڑاس نکالی جائے۔ مدیر "اردو دنیا" کو چاہیے تھا کہ مذکورہ مضمون شامل اشاعت کرنے سے پہلے نفسِ مضمون پر ایک نظر ڈال لیتے۔ آئندہ اس سلسلے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

● فضیل جعفری صاحب نے احمد فراز کی کسی شخصی کمزوری کا ذکر نہیں کیا ہے، فراز کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے آپ کو اختلاف کا حق ہے۔ ادارہ

■ شیخ عبداللہ بھارت نگر، آکولہ نمبر-3، مہاراشٹر اسٹیٹ،

نومبر کے اردو دنیا کے شمارے میں محترمہ مہاشویتا دیوی کا افسانہ طلاق شائع ہوا ہے۔ موصوفہ قابل احترام ہیں شاید انھیں معلوم نہیں کہ طلاق کی لعنت صرف مسلمانوں میں نہیں، عیسائیوں اور ہندوؤں میں بھی ہے۔ عدالتیں ایسے کیسوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اس طرف محترمہ کی نظر نہیں گئی۔ ورنہ وہ صرف مسلمان ہی کو نہیں بلکہ پوری انسانیت کو سبق سکھاتیں کہ معاشرہ گندگی سے پاک ہوکر صاف ستھرا بنے اور انسانیت پھلے اور پھولے۔ اگر وہ چاہیں تو اسلامی ادب کا مطالعہ کرکے دیکھ لیں۔ دل نہیں مان رہا تھا اس لیے آپ کے گوش گزار کردیا۔ بات طلاق ہی کی نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی قابل اصلاح ہے۔

■ جلیل عشرت، آر. پی. منزل، جہانگیری محلہ، آسنسول (ویسٹ بنگال)

لسانیات، شخصیات، سائنسی علوم، ادب اور "بچوں کا گوشہ" ماہنامہ "اردو دنیا" کی روح ہیں۔ معیاری نگارشات پیش کرنا ادارے کا وصف ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ "اردو دنیا" کی درازی عمر کی اکثر دعا کرتا ہوں۔

□□□

ہماری بات

تخلیقی ادب کے بارے میں خیال آرائیوں کا سلسلہ قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اور علمائے ادب نے ادب کی ماہیت اور اس کی ضرورت و اہمیت پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ تخلیقی ادب تخلیق کار کی شخصیت کا اظہار اور اس کے نجی معاملات و مسائل کی فنی پیشکش سے عبارت ہے لیکن جو لوگ ادب کے سماجی کردار پر زور دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ادیب جس سماج میں رہ رہا ہے، اس کی طرف سے اس پر کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں جن سے صرف نظر کرکے بامعنی ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کے کسی بھی دور کے ادب پر نظر ڈالیں، آپ کو اس میں اس دور کی زندگی کے واضح نقوش نظر آجائیں گے اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اس دور کا فلسفۂ حیات اور غالب نظریات و خیالات کیا تھے۔ یعنی دل کے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی شاعروں اور ادیبوں کو گہرا سروکار رہا ہے اور انھوں نے اپنے اندر کی آواز ہی پر نہیں، باہر کے شور و شغب پر بھی پورا دھیان دیا ہے اور اس کی ناگواری پر اپنے ردِ عمل کا اظہار بھی کیا ہے۔ ولی دکنی کو اردو کا پہلا اہم شاعر کہا جاتا ہے، اس نے جب غزل کا یہ مطلع کہا ہوگا:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

تو ظاہر ہے اس کا محرک خارج کا مشاہدہ ہوگا، دل کی کوئی داخلی ترنگ نہیں۔ میر کا شعر ہے:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میر کی داخلیت پسندی مشہور ہے یہ شعر بھی ان کی ایک داخلی کیفیت ہی کا اظہار ہے لیکن دل کی اس کیفیت کو مفلس کے چراغ سے تعبیر کرنا خارج کے مشاہدے اور اس سے متاثر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ میر کے ہاں ایسے شعر بھی موجود ہیں جو ولی کے مطلعے کی طرح محض خارجی حقیقت کو پیش کرتے ہیں مثلاً:

شہاں، کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اردو شعرا نے غزلوں کے علاوہ قصیدے، مثنویاں، مسدس، مخمس وغیرہ بھی لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر ان کے عہد کے عمومی رجحانات و میلانات سے بخوبی واقفیت ہو جاتی ہے۔ شہر آشوب تو ہے ہی ایک ایسی صنف سخن جو معاشرے کی خرابیوں اور بدحالیوں کے اظہار اور ان کے خلاف احتجاج کے لیے مخصوص رہی اور اردو کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ہو جس نے اس سے اجتناب برتا ہو۔ داغ کو محض معاملاتِ حسن و عشق کا شاعر سمجھا جاتا ہے مگر جب وہ اس طرح کے شعر کہتے ہیں:

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

تو کیا ان کے عہد کے پورے تہذیبی المیے کی واضح جھلک ان میں نہیں دیکھی جاسکتی۔ حالی، داغ کے ہم عصر تھے، ان کی ان غزلوں میں جنھیں وہ قدیم رنگ سے منسوب کرتے ہیں زندگی کی مختلف کیفیات کا جس خوبی سے اظہار ہوا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن آگے چل کر ان میں جو ذہنی تبدیلی آئی اس نے اس طرح کے اشعار کہلوائے:

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

مشرق میں عشق ایک اعلیٰ تہذیبی قدر کا ہم معنی رہا ہے، حالی جس عشق کو مطعون کر رہے ہیں وہ دراصل اس اعلیٰ تہذیبی قدر کا ایک ارذل تصور ہے جسے مغرب کی استعماریت نے اپنی سیاسی مقصد برآری کے لیے عام کرنے کی کوشش کی۔ اقبال اس استعماری چال کو سمجھ گئے تھے اسی لیے انھوں نے اپنے کلام میں عشق کی پرزور وکالت کی ہے۔

ادب کی ترقی پسند تحریک ایک عالمی تحریک تھی۔ ہندوستان میں 1936 کے آس پاس جب اس کا آغاز ہوا تو نئے لکھنے والوں نے تو اس کا خیر مقدم کیا ہی، پرانے لکھنے والوں نے بھی نظر استحسان سے دیکھا، پریم چند نے ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس کی صدارت بھی کی اور تحریک کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زمانۂ عروج میں جو لگ بھگ پندرہ سولہ سال پر پھیلا ہوا ہے شعر و ادب کے موضوعات میں بڑی وسعت آئی۔ بہت سے موضوعات جو اس وقت تک ٹاٹ باہر تھے، ادب میں داخل ہوئے اور تنوع اور تازگی کی سوغات اپنے ساتھ لائے۔ اشرافیہ کی برتری کے تصور کو خیر باد کہا گیا اور عام آدمی اور اس کے جذبات و احساسات کو اہمیت دی جانے لگی۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر لکھا جانے لگا اور سماج میں طبقاتی درجہ بندی کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ یہ ادب میں زبردست چہل پہل کا دور تھا۔ لیکن 1949 میں بھیونڈی میں ترقی پسندوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں تحریک کے سیاسی کردار پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور موضوعات کی تحدید کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ لکھنے والے استعاراتی یا علامتی اسلوب اختیار کرنے کی بجائے دو ٹوک الفاظ اور براہ راست زبان میں بات کریں اور بات بھی وہی ہو جو تحریک کے قائدین کی زائیدۂ فکر ہو۔ اس سے تحریک میں انتشار پیدا ہوا اور دھیرے دھیرے یہ بے اثر ہوگئی۔

1960 کے آس پاس جدیدیت کا رجحان سامنے آیا۔ اس کے اور جو بھی اسباب و علل رہے ہوں لیکن اس کا ایک بڑا محرک نئے لکھنے والوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ نظریاتی حصار بندی سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لیں اور اپنے گرد و پیش سے براہ راست اپنا رشتہ قائم کریں۔ جدیدیت کا رجحان بھی خوب پھولا پھلا لیکن اس رجحان کو ایک واضح شکل دینے کی دھن میں جب یہاں بھی نئے پن کے کچھ خاص معیار مقرر کیے جانے لگے اور انھیں سامنے رکھ کر قلم اٹھانے پر کچھ زیادہ ہی زور دیا جانے لگا تو اس کا بھی ردِ عمل ہوا اور اب یہ رجحان بھی اپنی تب و تاب کھو چکا ہے۔ اب مابعد جدیدیت کی باتیں ہو رہی ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھی دوبارہ فعال بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ادیب یا شاعر اپنی سماجی ذمے داری سے منکر نہیں ہوسکتا، مگر اس کی ذمے داری کیا ہے، وہ کیا لکھے اور کیا نہ لکھے، اسے اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ: گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش، لیکن کسی ادیب یا شاعر کی ذہنی گمراہی خود اسے تو صراط مستقیم سے بھٹکا سکتی ہے، ادب کے دھارے کو جو زندگی کی طرح ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے، غلط راستے پر نہیں ڈال سکتی۔ اس وقت ہمارا ملک مذہبی تنگ نظری، علاقائی عصبیت، لسانی تعصب، سیاسی اور سماجی غیر ذمے داری، خود ارتکازی، نفاق اور کرپشن اور بھرشٹاچار کے جن مسائل سے دوچار ہے، ان کی سنگینی کا احساس اور کسی کو ہو نہ ہو، اہل قلم کو ضرور ہے اور وہ ان مسائل پر اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھ بھی رہے ہیں۔ انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانے اور ان کی تحریروں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی اگر مربوط کوششیں کی جائیں تو وہ زیادہ حوصلہ مندی اور امنگ کے ساتھ لکھیں گے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں سرگرم ادبی انجمنوں کے قیام کی جو کوشش بھی کی جائے اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

□□□

محمد احسن

جدید ترقیاتی منظرنامہ اور اردو

زبانیں مخصوص سماجی و تاریخی سیاق و سباق اور مخصوص سیاسی و تہذیبی فضا میں پیدا ہوتی، ترقی کرتی اور کبھی کبھی زوال سے ہم کنار بھی ہوتی ہیں۔ ارتقائی مراحل میں کسی زبان کے بولنے والے اپنی زبان سے اِس حد تک وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اسے اپنا تہذیبی ورثہ سمجھتے ہیں، اور اس تہذیبی ورثے کے تحفظ کے لیے مختلف راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر کوئی لسانی معاشرہ، سیاسی اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر منقسم ہو جاتا ہے تو اس زبان کے بولنے والے لسانی اعتبار سے ایک دائرے میں رہتے ہوئے بھی اکثر اوقات مختلف لسانی علائم کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے سیاق و سباق میں دل چسپ بات یہ ہے کہ بول چال کی حد تک دونوں زبانیں ایک ہیں مگر ایک اسے اردو کہتا ہے تو دوسرا ہندی۔

ہندی اور اردو بولنے والوں کا جغرافیائی اور تہذیبی سطح پر Ethos مشترک ہے۔ جب 1956 میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیلِ نو عمل میں آئی اور ہر ریاست کی زبان کو اس ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا تو اردو کو بھی جموں و کشمیر کی سرکاری زبان بنا دیا گیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر اردو اُن کی مادری زبان نہیں تھی اور نہ ہے۔ کشمیریوں کی زبانیں کشمیری، ڈوگری اور لداخی وغیرہ ہیں۔ حکومت کے اس فیصلے کو جب شدت پسند مسلم سیاست نے بہ خوشی قبول کر لیا تو فطری طور پر عوام الناس کے ذہنوں میں اس غیر منطقی خیال کو تقویت ملی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ نتیجتاً پورے شمالی ہند بالخصوص اتر پردیش میں اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد میں نمایاں کمی آئی کیوں کہ حکومت نے اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کا نظام مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیلِ جدید کی وجہ سے ہریانہ، پنجاب مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں اردو نہ صرف سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گئی بلکہ functional language کے طور پر اس کا دامن سمٹتا ہی چلا گیا اور وہ مذہب اور ادب کی زبان بن کر رہ گئی۔ ریاستوں کی تنظیمِ نو کے بعد پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش میں اردو کی جگہ پنجابی اور ہندی پڑھائی جانے لگیں۔ یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل جدید سے قبل بھی اردو کو کشمیر کی شاہی ریاست میں ایک ذیلی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی مگر اس میں بھی عوامی خواہشات کا کوئی رول نہیں تھا۔ اس وقت بھی اردو کشمیر کے عوام پر تھوپی ہوئی زبان تھی۔ عوام تو اپنی ہی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔

بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ 1947 کے بعد ہندوستان میں اردو صرف اور صرف مسلمانوں تک محدود ہو گئی ہے اس لیے اس کی ترقی و ترویج کی کوئی بھی کوشش مسلمانوں کو شریک کیے بغیر ممکن نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اردو زبان اس حد تک مسلمانوں کی تہذیبی اور مذہبی شناخت میں پیوست ہو چکی ہے کہ اسے ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلے پر تاریخی، تہذیبی اور سیاسی سیاق میں غور کیا جائے۔ اِس ضمن میں دو نکتے خاص طور پر اہم ہیں۔ اوّل یہ کہ نسلی لسانیات (Ethno-linguistics) ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زبان کی نسلی شناخت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ دوئم یہ کہ ان میں سے ہر فرد کی مختلف شناخت ہے اور یہ شناخت زبان، مذہب، علاقائی ماحول، تہذیبی روایات اور پیشہ ورانہ وابستگی سے اخذ کی جاتی ہے۔ اردو میری شناخت کا ایک اہم جزو ہے، اس لیے نہیں کہ یہ میری مادری زبان ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ میں نے اس کے ذریعے اپنے مذہبی و تہذیبی ورثے کو اپنے وجود میں اتارا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ مشترک لسانی شناخت مذہبی تفریق سے بالاتر ہوتی ہے۔

اردو تعلیم کی پسماندگی اور بدحالی کا تعلق سرکاری افسران کے تغافل اور خود ہماری غیر سنجیدگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اگر ایک جانب اردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے تو دوسری جانب اردو زوال پذیر نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم ان الفاظ کے معنوی حدود کا تعین کیے بغیر اور ان کو سمجھے بغیر ان اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی زبان کا مستقبل تابناک ہے تو وہ زوال پذیر نہیں ہوگی اور اگر زبان زوال پذیر ہے تو اس کا مستقبل تابناک نہیں ہو سکتا۔ کسی زبان کے مستقبل کی تابناکی کا دارومدار اس کے بولنے والوں کی شرح خواندگی پر ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اردو آبادی کی شرح خواندگی ہندوستان کی عام شرح خواندگی سے بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر بہار کے ایک ضلع کشن گنج میں اردو آبادی کا تناسب 53.61 فی صد ہے اور یہ شرح خواندگی میں ہندوستان کا سب سے پچھڑا ہوا ضلع ہے کیونکہ اس ضلع کی شرح خواندگی صرف 17.5 فی صد ہے۔ اردو کے مستقبل کی تابناکی اسکولی سطح کی اردو تعلیم، کم از کم پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول کی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم سے

وابستہ ہے۔ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول تک اردو تعلیم کی ٹوٹی ہوئی کڑی کو جوڑنے کے لیے موثر اقدامات اور منظم پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ پالیسی اتنی مستحکم ہونی چاہیے کہ یہ ان تمام عوامل کو پیش نظر رکھ سکے جو اردو تعلیم کے زوال کے ذمے دار ہیں۔ ان پالیسیوں کو وضع کرتے وقت ہمیں ان وجوہ پر بھی غور کرنا ہوگا جن کی وجہ سے اردو کی ترقی سے متعلق سرکاری پالیسیاں مسلسل ناکام ہوتی رہی ہیں۔ اردو تعلیم کے فروغ کے لیے ایسے اقدام بھی کرنے ہوں گے جن کے تحت اردو تعلیم کو بازار کی ضرورتوں سے جوڑا جاسکے اور تکنیکی اور انتظامی سطح پر اس کی افادیت نمایاں کی جاسکے۔ سچر کمیٹی کی سفارشات بھی ان ضرورتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس رپورٹ کے چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ آئین ہند کی 93ویں ترمیم کے بعد 14 سال تک کے ہر بچے کو یہ آئینی حق حاصل ہے کہ حکومت اسے مادری زبان میں بنیادی تعلیم مہیا کرائے۔ (اس پس منظر میں ہم اردو والوں کو حکومت سے پرزور مطالبہ کرنا چاہیے کہ اردو آبادی والے علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم کا معقول نظم کرے۔)

2۔ اردو آبادی کے علاقوں میں Central Schools اور Jawahar Navodaya Vidyalaya کے طرز پر اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں تاکہ اردو مادری زبان والے بچے ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ (اس سفارش پر جلد از جلد عمل درآمد کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔)

3۔ حکومت ایک ایسے مرکز کی تشکیل کرے جہاں دینی مدارس کو اعلیٰ ثانوی بورڈ سے منسلک کردیا جائے تاکہ وہ طلبہ جو عصری تعلیم Main Stream Educational System میں شامل ہونا چاہتے ہوں انھیں آسانی ہو۔ دوسرے لفظوں میں مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کو پیشہ ورانہ اور ووکیشنل کورسز میں داخلے کے لیے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ خاص طور سے ان کورسز کے لیے جن میں داخلہ انٹرنس ٹسٹ / مقابلہ جاتی امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ (اگر اردو والے معاشی اور تعلیمی سطح پر اپنے لیے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کے لیے خود آگے بڑھ کر کام کرنا ہوگا اور عوامی سطح پر بیداری بھی پیدا کرنی ہوگی۔)

4۔ مسابقاتی امتحانات کے لیے دینی مدارس کی اسناد کو منظوری دی جانی چاہیے تاکہ مدارس کے فارغین مقابلہ جاتی امتحانات جیسے سول سروسز، بینک، ڈیفنس سروسز اور دوسرے اس طرح کے امتحانات میں شرکت کے اہل ہوں۔

5۔ اسکولی نصاب کے مواد کا جائزہ لینے کے عمل کی طرف پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کرنا چاہیے۔

6۔ UGC کو ایک ایسے نظام کی ابتدا کرنی چاہیے جس کے تحت کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے ایک حصہ مختص ہو۔

7۔ خود مختار کالجوں اور عام یونیورسٹیوں میں تمام سماجی و مذہبی حلقوں میں سب سے زیادہ پس ماندہ طبقے کے داخلے کو آسان بنانے کے لیے ایک متبادل اصول داخلہ وضع کیا جانا چاہیے۔

سچر کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد محض مسلمانوں کی بدحالی اور خستہ حالی نہیں ہے بلکہ اس پس منظر میں ہندوستان کا آئین بھی ہے۔ ہندوستان کا آئین تمام شہریوں کو ان کی تہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گزارنے کی ضمانت دیتا ہے۔ زبان کے حوالے سے دستور ہند کی مختلف دفعات اور شقوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی ہر ریاست اور ریاست کے ہر بااختیار ادارے کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ لسانی اقلیت سے تعلق رکھنے والے بچوں کو ان کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے لیے معقول سہولتیں فراہم کرے۔

دستور کی دفعہ 350-A میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ ریاستی یا مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ عوام کی مرضی کے خلاف ذریعۂ تعلیم کے طور پر کوئی بھی زبان استعمال کرے۔ باوجود اس کے زمینی حقیقت یہ ہے کہ ملک کے بیشتر صوبوں میں آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ذریعۂ تعلیم وہ نہیں جو شہریوں کا حق ہے۔ لہٰذا اس سمت میں بھی سیاسی سطح پر کوششوں کی ضرورت ہے۔

یونیورسٹی کی سطح پر اردو تعلیم کا نظام تقریباً ہندوستان کے ہر اردو آبادی والے خطے میں موجود ہے۔ لیکن اسکولی سطح پر چند ریاستوں کو چھوڑ کر اردو ذریعۂ تعلیم کا کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اس مسئلے کی سنجیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو ماڈل اسکول حیدرآباد اور دربھنگہ میں قائم کیے ہیں اور اس کے منصوبے میں اس نوع کے مزید اسکول اردو علاقوں میں قائم کرنا شامل ہے۔ اسے اس سلسلے میں ایک مثبت پیش رفت کہا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کے مستقبل کو اردو رسائل، اخبارات اور کتابوں کی تعداد اشاعت اور معیار کو مدنظر رکھ کر بھی پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حکومت ہند کی جانب سے جاری کردہ Statistics کے مطابق اردو کتابوں کی اشاعت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے لیکن ہر سال گنتی کی معیاری کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ عصری علوم مثلاً سماجیات، لسانیات، سیاسیات، معاشیات، اور سائنس جیسے موضوعات اردو والوں کی بے توجہی کا شکار رہتے ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً 2.5 کروڑ اردو آبادی کے اگر صرف 5.2 فیصد لوگ سالانہ ہزار روپے اردو کتابوں کی خرید پر خرچ کریں تو صورت حال میں بڑی مثبت تبدیلی آسکتی ہے۔

اردو میں شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبارات میں سے اکثر محض مسلمانوں کا جذباتی استحصال کرنے یا کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا پروپگنڈہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اردو کے چندہ روزہ اخبارات ورسائل بالعموم مسلمانوں کی زبوں حالی کی سرخیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ماہناموں میں ادبی، نیم ادبی، فلمی اور مذہبی رسالے ہیں۔ ان میں خواتین کے رسالوں کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا سرکولیشن بہت محدود ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مسئلہ Readership سے زیادہ اخبار کے معیار اور مواد سے جڑا ہوا ہے۔ اخبارات ورسائل کے معیار کا اچھا ہونا اہم شرط ہے۔ جہاں معیار اچھا ہے، مواد بھرپور ہے وہاں قاری کی کوئی کمی نہیں۔ اگر کسی اخبار یا رسالے میں قاری کو وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جو وہ پڑھنا پسند کرتا ہے تو اسے نہ Readership کی کمی ہے اور نہ اشتہارات کی۔

ہمیں یہ بات ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ تمام زندہ زبانیں اپنی بقا کے لیے بدلتے ہوئے حالات کے اثرات کو قبول کرتی ہیں اور وقت کے دھارے کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑتی ہیں۔ موجودہ دور میں وہی زبانیں زندہ رہیں گی جو اپنے آپ کو الکٹرونک اور ٹیکنالوجیکل منظر نامے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سکت رکھتی ہوں۔ ابھی اکثر اردو پڑھنے والے کمپیوٹر کی سہولتوں سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کرپاتے جب کہ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ اردو کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ سے بھی جوڑا جائے۔ آج کے تعلیمی نظام میں کمپیوٹر ایک اہم رول ادا کرتا ہے اور نئی نسل کے بچے بھی اپنی زبان اور تہذیب کو اس کی مدد سے جلد سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اردو سوفٹ ویئر کے فروغ کی سمت میں کام کیا جائے۔ اردو میں اب ایسے سوفٹ ویئر بھی موجود ہیں جن کی مدد سے ہم اردو سیکھنے سکھانے کا کام کرسکتے ہیں۔ ونڈوز 2003 نے بھی اپنے office system میں ایسی سہولت مہیا کرادی ہے کہ ہم براہ راست اردو میں میل اور Chatting کرسکتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے اس لیے ضروری ہے کہ اردو جاننے والوں کو اس سہولت کے بارے میں بتایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ سوفٹ ویئر ڈیولپ کرنے والوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ اردو والے بھی اس کا استعمال کرتے ہیں تاکہ دنیا کی اور زبانوں کی طرح اس زبان میں بھی نئے نئے سوفٹ ویئر ڈیولپ کیے جاسکیں۔ یہ دنیا تو بازار کی دنیا ہے اگر ہم اپنی ضرورت بتائیں گے تو اپنے اقتصادی فائدے کے لیے ہی سہی وہ اردو کو بھی اس ٹیکنالوجی سے جوڑیں گے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اردو آبادی کو بھی ایک بڑا صارف بننا پڑے گا۔

اردو زبان اور تعلیم کا فروغ محض ایک زبان کی بقا کا سوال نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی جذباتی مسئلہ ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی شناخت کے تحفظ اور اس کی بقا کا مسئلہ ہے اور اس کے لیے ہم تمام اردو والوں کو خلوص نیت سے محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ □□□

پتہ:
Regional Director RC-MANUU, 12-Ahmadabad Place Road, Kohe Fiza, Bhopal-462001

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعرو ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں شمس الرحمٰن فاروقی، مغنی تبسم اور محمد نسیم الدین فریس جیسی شخصیات سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

درخشاں زریں

لسانی مطالعے کی اہمیت

آج لسانیات کا علم زندگی کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی سطح پر اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اگر چہ ایک عام آدمی یہ سوال کرسکتا ہے کہ ہم ایک اچھی بھلی زبان بولتے ہیں اور وقت ضرورت ہم اس کے ذریعے اپنے خیالات کی ترسیل بھی کرتے ہیں، پھر زبان کی پیدائش، اس کے ارتقا اور اس کے عروج وزوال کی معلومات سے ہمیں کیا حاصل؟ ان معلومات کے بغیر بھی ہم ایک اچھی بھلی زبان بولتے ہوئے زندگی گزار سکتے ہیں۔ معصوم لوگوں کو یہ بات ضرور مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ زبان ہمارے خیالات کی ترسیل کا صرف ایک ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیب اور ہمارے کلچر کی پہچان ہوتی ہے اور اگر ہمیں اس پہچان کی حفاظت کرنی ہے تو پھر اس کے بارے میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی معلومات کی فراہمی لازمی ہے۔ یہ معلومات ہمیں لسانیات کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ ایک علم کی حیثیت سے بھی لسانیات کا مطالعہ اپنے اندر ڈھیر سارے پیغامات چھپائے ہوئے ہے جن کی گرہ کشائی اس کے مطالعے کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس علم کو ہم پوری توجہ کے ساتھ اپنائیں اور اسے آگے بڑھانے کی سعی کریں۔

لسانیات جہاں، ہمیں اپنی زبان کے سمجھنے اور بچائے رکھنے میں ہماری مدد کرتی ہے وہیں دوسری زبانوں سے رشتۂ انسلاک پیدا کرکے دنیا کے تمام افراد کو ایک رشتے میں جوڑنے کا کام بھی کرتی ہے۔ بطور مثال ہم آٹھویں صدی کے اس واقعے کا ذکر کریں جب سر ولیم جونس نے کالی داس کی ''شکنتلا'' کا ترجمہ کیا اور دوران مطالعہ اس پر یہ راز منکشف ہوا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانیں سب ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یورپ کے گورے اور ہندوستان کے کالے باشندے ایک ہی نسل سے ہیں۔ اس تحقیق سے گرچہ انگریزوں کے احساسِ برتری کو دھکا لگا لیکن اس سے لوگوں میں وسیع النظری اور وسیع المشربی بھی پیدا ہوئی۔ قوموں کی طرح لسانیات بھی پوری بنی نوع انسان کو کئی حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور یہ لسانی گروہ اتنے بڑے اور طاقت ور ہیں کہ انھوں نے اکثر ملکی سرحدوں کو بھی مسمار کردیا ہے۔ مثلاً آئرلینڈ سے لے کر بنگال تک ایک ہی نسل کے لوگ موجود ہیں۔ انڈونیشیا اور دور افتادہ مدغاسکر کی زبان میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اہلِ مدغاسکر چل کر انڈونیشیا تک پہنچے[1] اس طرح زبان کے مطالعے کے ذریعے تو تاریخ سے بھی ہم واقف ہوجاتے ہیں۔

دوسری جانب رسم الخط کی بات کریں تو اس کا مطالعہ بھی ہمیں ماضی کی تاریخ کی جانب لے جاتا ہے۔ رسم الخط کے اشتراک کا پھیلاؤ زبان کے پھیلاؤ سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ چین اور جاپان کے باشندے بہ ظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی زبانوں کا مطالعہ کریں تو کوئی یکسانیت نہیں۔ باوجود اس کے دونوں کا رسم الخط ایک ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ان دونوں کے بیچ لسانی اشتراک تھا لیکن پھر وقت اور حالات نے انھیں ایک دوسرے سے جدا کردیا اور آج یہ دو مختلف قومیں ہوگئیں لیکن رسم الخط کا اشتراک کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہا۔

ہندوستان میں بنگالی اور آسامی زبانوں کے رسم الخط کو دیکھ کر بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کے بیچ پہلے گہرا اشتراک تھا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی آتی گئی اور آج یہ دونوں زبانیں الگ الگ نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس طرح مختلف زبانوں کے آپسی رشتے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں ہونے والی تبدیلیوں کا پتا ہم لسانیات کے ذریعے آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ خود ہماری آریہ نسل کے باشندوں کا وطن کیا تھا، وہ ہندوستان کب آئے، ان کی بود و باش کیا تھی؟ اس طرح کے کئی سوالات کے جوابات ہمیں قدیم آریائی زبانوں کے بعض الفاظ سے مل جاتے ہیں۔ من جملہ یہ کہ زبانوں کے خاندان کے ساتھ ساتھ لسانیات، انسانی نسل اس کے خاندانوں اور ان کے پھیلاؤ کو سمجھنے میں بھی ہمیں بڑی مدد فراہم کرتی ہے۔

زبان دلوں کے جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ لہٰذا زبان کی فطرت سے واقفیت سماجی کارکن کے لیے بھی ضروری ہوتی ہے۔ ایک سماجی کارکن جن لوگوں کے بیچ کام کرتا ہے ان لوگوں کی زبان مختلف ہوسکتی ہے، ان کی زبانوں کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔ اس فرق کو جاننا اور اسی کے اعتبار سے زبانوں کو سیکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں اٹھارھویں صدی میں انگریزوں کا عمل دخل جب باضابطہ شروع ہوگیا تب ان لوگوں نے اپنے کام کاج کی خاطر یہاں کی زبانوں کو سیکھنا ضروری سمجھا[2] اور انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ قومی سطح پر بھی لسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے لسانیاتی نقطۂ نظر کی ضرورت پڑتی ہے۔ معیاری زبان، قومی زبان، سرکاری زبان،

علاقائی زبان، شہری زبان، دیہی زبان، کاروباری زبان اور نسوانی زبان وغیرہ کئی اقسام ہیں جنھیں سمجھنے اور ان کا مقام متعین کرنے کے لیے لسانی فطرت اور نقطۂ نظر کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

زبان کے مطالعے میں علمِ عضویات (Physiology)، علمِ طبیعیات (Physics)، علمِ ریاضی (Mathematics) اور تاریخ (History) وغیرہ سے بھی مدد لی جاتی ہے۔

مختلف قوموں کی جسمانی ساخت اور منہ کے مختلف حصوں کا علم ان قوموں کی آوازوں کے جائزے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً صوتیاتی مطالعے کے لیے اعضائے نطق کا مطالعہ اشد ضروری ہے جو علمِ عضویات کے بغیر ممکن نہیں[3]۔ آواز کا ہوا کی لہروں پر جانا، مصوّتہ اور انفی آوازیں سے ہوا پر مختلف لہروں کا بننا جیسے موضوعات علمِ طبیعیات کے ذیل میں آتے ہیں۔ لسانیات تاریخ سے بھی متعلق ہے۔ تاریخ کا مطالعہ مختلف قوموں کے باہمی تصادم، تجارتی تعلقات اور تہذیبی اختلاط کے متعلق مواد فراہم کرتا ہے، غالب اور مغلوب کی زبانوں کے میل جول اور اس کے نتائج پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جغرافیہ اور لسانیات کا بھی نہایت گہرا رشتہ ہے۔ پہاڑی علاقے کی بولیاں محدود ہوتی ہیں جبکہ میدانی علاقے میں زبان دور تک پھیلتی ہے، ان کا مطالعہ جغرافیہ کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ شہروں اور مقامات کے جغرافیائی نام سے بھی زبان کی فطرت اور اس کے ارتقا کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح سماجیات کے حوالے سے ریاضیات سے بھی اس کا رشتہ اٹوٹ بن چکا ہے۔ اس طرح کہ اعداد و شمار کے ذریعے جب ہم بعض اوقات کسی زبان کی قدامت اور اس کی اصل کا پتا لگاتے ہیں تو وہاں ہماری نظر ریاضیات کی جانب ہی ہوتی ہے۔

بعض چھوٹے بچوں میں ہکلانے کی بیماری پائی جاتی ہے۔ یہ ہکلاہٹ کیوں ہوتی ہے، اس کی زبان کیسے سدھاری جاسکتی ہے یا پھر گونگوں میں بات کرنے کی صلاحیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے؟ ان سب مسائل کے حل کی تلاش لسانیات کے ذریعے ہی کی جاتی ہے۔ اس کے لیے خصوصاً لسانیات کے شعبۂ صوتیات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خفیہ ایجنسیوں اور جاسوسی محکمے میں لسانیات کا سہارا لے کر پیچیدہ سے پیچیدہ حل تلاش کرنے اور چھپے راز منکشف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔

کسی زبان کی ترقی اور اس کی حفاظت کا دارومدار اس زبان کی لسانیات پر ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم یا تہذیب کی مادری زبان اس سے گہرے طور پر وابستہ ہوتی ہے جو اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ ایسے میں کسی قوم یا تہذیب کو زیر کرنے کا ایک بہتر طریقہ اس سے اس کی مادری زبان چھین لینا بھی ہے۔ اس کے لیے یا تو رسم الخط تبدیل کرنے کی بات کی جاتی ہے یا پھر ایک زبان کو دوسری زبان میں ضم کرنے کی بات ہوتی ہے۔ اس بات سے انکار قطعی ممکن نہیں کہ رسم الخط اور زبان کا تعلق ٹھیک اسی طرح ہے جیسے ہمارے جسم میں گوشت اور چمڑی کا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ جب اس طرح کی لسانی پریشانیاں سامنے آتی ہیں تو ان کا تدارک بھی لسانیات کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ ''لسانیات'' کسی زبان کو اس کا صحیح منصب اور صحیح مقام عطا کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں لسانیات کا سہارا لے کر بڑے بڑے مسائل سلجھانے اور نئے نئے علوم منکشف کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

کوئی بھی ادب زبان کی بنیاد پر ہی فروغ پاتا ہے۔ کیوں کہ ادب کی تخلیق کا ذریعہ زبان ہوتی ہے اور جب نقاد اس تخلیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ مطالعہ ادب اور لسانیات کے ذیل میں آتا ہے۔ ہر زبان کا ادب اس زبان کی ساخت سے گہرے طور پر وابستہ ہوتا ہے، کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے جمالیاتی تاثر کا اندازہ لسانیات کے ذریعے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ زبانوں کے آغاز و ارتقا کا مطالعہ کرتے وقت ہم جن کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں ان میں زیادہ تر کا تعلق ادب سے ہی ہوتا ہے۔ ادب کی قدیم کتابوں کے مطالعے سے ہم دنیا کی بیشتر زبانوں کے آغاز و ارتقا کے رجحان کا پتا لگا سکتے ہیں۔

لسانیات ایک ایسا شعبہ ہے جو ایک مدرس کو درس و تدریس کا ہنر سکھاتا ہے۔ مدرس لسانیات کے ذریعے کئی طرح کے مسائل حل کرسکتا ہے۔ جیسے ادب کے کسی شعری حصے کی تدریس ہو رہی ہو تو لسانیات کا معلم لسانیات کے ذریعے ہی یہ بات جان سکتا ہے کہ کسی خاص شعر یا غزل کی لسانی خوبی کیا ہے؟ ان خوبیوں کو شاعر نے کیسے برتا ہے؟ اس سے انداز بیان میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی ہے؟ وغیرہ وغیرہ (ایسے مطالعے کو ہم ادب میں ''اسلوبیاتی تنقید'' کہتے ہیں)۔ اس طرح کی باتوں سے معلم کے اندر وسعت خیال پیدا ہوگی اور وہ اپنے تدریسی فرائض کو زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ انجام دے پائے گا۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح سے لسانیات کا علم زبان کے استاد کو مدد پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں زبان کے استاد کے لیے لسانی اصولوں کا علم لازمی سمجھا جانے لگا ہے۔ ان ممالک میں زبان کی نصابی کتابوں کی تیاری میں بھی لسانیاتی اصولوں سے مدد لی جاتی ہے۔

لسانیات، سائنس ہے یا فن اس موضوع پر زمانہ قدیم سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات میکس مولر اسے طبعی سائنس بتاتا ہے۔ جب کہ وھٹنے (Whitney) اس بات پر مصر ہے کہ لسانیات، تاریخی سائنس کا ایک شعبہ ہے۔ لیکن جدید دور میں علمِ لسانیات نے جس طرح اپنا چولا بدلا ہے اسے دیکھتے ہوئے علمائے لسان کا کہنا ہے کہ لسانیات ایک سائنسی مطالعہ ہے۔ اس میں زبان سے متعلق تمام باتیں سائنٹفک انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ الفاظ

اور معنی میں کیا رشتہ ہے؟ معنی کے بغیر زبان کا کوئی وجود ہے یا نہیں؟ یا پھر زبان اور بولی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے کئی سوالات ہیں جو زبان کے انتہائی پیچیدہ اور پُراسرار عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پیچیدہ عمل کی مختلف جہات سے پردہ اٹھانا، ان کا تجزیہ کرنا اور انھیں سائنسی علوم کی گرفت میں لے کر سمجھنا اور سمجھانا یہ سب جدید لسانیات کا کام ہے، جدید لسانیات اپنے معروضی نظریے سے ان ساجی گتھیوں کو سلجھاتی اور ان کا حل سامنے لاتی ہے۔[4]

لسانیات، ایک سائنسی علم کیسے ہے؟ اسے جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ان اصولوں پر نظر رکھنا ہوگا جن کی بنا پر سائنس، سائنس کہلاتی ہے۔ عام طور پر سائنس کو دو اور دو چار کے مصداق قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی لاگ لپٹ نہیں ہوتی اور باتیں دوٹوک بیان کی جاتی ہیں جب کہ فن میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ کبھی ہمیں آسمان کی سیر کراتا ہے تو کبھی زمین کی۔ اس کا تعلق اصل کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تصوراتی دنیا سے بھی ہوتا ہے۔ سائنس کی بنیاد علم پر قائم ہوتی ہے۔ یہ ہمیں چیزوں کا علم دیتی ہے، ان کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتی ہے اور حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔ برخلاف اس کے فن ہمیں متاثر کرتا ہے، اس سے جذبہ واحساس بیدار ہوتا ہے اور یہ ہمیں حقیقت کے ساتھ ساتھ خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ لہٰذا فن کو ایک ایسی سرگرمی اور عمل کا نام دیا جاسکتا ہے جس کا مقصد کرنا ہے نہ کہ جاننا۔ جب کہ سائنس کا مقصد صرف جاننا ہے۔ سائنس اغراض ومقاصد پر دھیان دیے بغیر علم کے جاننے میں سرگرم عمل رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں ان کے نئے نئے راز منکشف ہوں۔ جیسے آئن اسٹائن نے ایٹمی طاقت دریافت کرتے وقت یہ ہرگز نہ سوچا ہوگا کہ اس کو ہیروشیما یا ناگاساکی پر آزمایا جائے گا۔ اس نے صرف علم کی وسعت کے لیے سائنس کی خدمت کی۔ یہی انداز ایک ماہر لسانیات کا بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی زبان کو مکمل یا ناقص نہیں سمجھتا بلکہ اس زبان کو واقعیت پسندی سے جانچتا ہے[5] اور اس کے تمام اصول وضوابط اور خصوصیات ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے تاکہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوسکے۔ اس طرح سے دیکھیے تو لسانیات بھی سائنس کے زمرے میں آتی ہے۔

سائنس کا علم منظم (Sistamatic) ہوتا ہے۔ نظم اس علم کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یعنی مطالعے کے مختلف درجوں کا مطالعہ باقاعدگی اور بنیادی اصول کے اعتبار سے طے کیا جائے۔[6] ماہر لسانیات زبان کے مطالعے، توضیح اور تحقیق وتفتیش میں بھی ایک قسم کی باقاعدگی اور نظم وترتیب کو ہر لحظہ ملحوظ رکھتا ہے۔ زبان ایک پیچیدہ مظہر ہے۔ اس کے پیچ در پیچ ڈھانچے کے مطالعے میں اگر باقاعدگی نہ برتی جائے اور نظم وترتیب کا خیال نہ رکھا جائے تو اس مطالعے سے کسی عام نتیجے تک پہنچنے میں سخت دشواری پیش آسکتی ہے۔ لہٰذا لسانیاتی مواد کے مطالعے اور تجزیے میں باقاعدگی اور نظم وترتیب کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک ماہر لسانیات سب سے پہلے آوازوں کی ادائیگی اور مصوتوں اور مصمتوں میں ان کی تقسیم اور درجہ بندی سے بحث کرتا ہے، پھر وہ مخصوص زبان کی ممیز آوازوں کی شناخت اور ان سے ترتیب پانے والی صوت رکنی ہیئتوں کا مطالعہ کرتا ہے، اس کے بعد الفاظ کی ہیئت وساخت کے مطالعے کا مرحلہ سامنے آتا ہے، پھر ان الفاظ کی ترتیب اور جملوں اور فقروں میں ان کی ترتیب وتنظیم پر غور کیا جاتا ہے، اس کے بعد الفاظ اور ان کے باہمی ربط وتسلسل سے پیدا ہونے والے معانی ومطالب کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سارا مطالعہ ایک تنظیم وترتیب کے ساتھ عمل میں آتا ہے۔ لسانیاتی مواد کے اس مطالعے اور توضیح وترتیب کو علی الترتیب صوتیات، تجز صوتیات، صرف ونحو اور معنیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سائنسی مطالعے میں واقعیت پسندی لازمی ہوتی ہے۔ اس میں جذبات اور ذاتی پسند وناپسند کا دخل نہیں ہوتا۔ لسانی مطالعے میں بھی توضیح کی ہر سطح پر معروضی اندازِ فکر سے کام لیا جاتا ہے اور صرف مواد کی سطح پر تجزیہ یا تنقید کی جاتی ہے۔ لسانیات کی ایک شاخ صوتیات کے مطالعے سے سیکڑوں بار بھی گزارا جائے تو بھی وہی نتائج اور فیصلے سامنے آئیں گے جو پہلے آئے تھے۔[7] جیسے منہ سے نکلنے والی آوازوں میں۔ ت، تھ، د، دھ وغیرہ وندانی آوازوں کو جتنی بار بھی ہم ادا کریں ایک ہی سطح کی آواز نکلے گی۔

لسانیات ایک ایسا علم ہے جس میں زبان کے مطالعے کے لیے زبان کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ یعنی لسانیات کا مواد اور موضوع بھی زبان ہے اور اس کے مطالعے کا ذریعہ بھی زبان ہے۔ لسانیات میں زبان دوہرا کردار ادا کرتی ہے اس لیے اس کے استعمال میں نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ سائنس کی زبان کی طرح لسانیات کی زبان بھی حددرجہ قطعی ہوتی ہے۔ اس میں علامتی انداز کا کوئی دخل نہیں۔ اگرچہ تاریخی اور تقابلی لسانیات میں علامت اور ابہام کی دخل اندازی ہوتی تھی لیکن جیسے جیسے یہ علم تجزیے اور توضیح کی جانب بڑھتا گیا اس کی زبان میں بھی قطعیت آتی گئی اور آج ایک سائنسی علم کی طرح ابہام وعلامت کی دنیا کو لسانیات بھی ترک کرچکی ہے۔

سائنس کے اصول، مطالعے پر مبنی ہوتے ہیں اور مطالعے کے لیے مشاہدے کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جنھیں ہم دیکھ سکیں، چھوسکیں اور ریکارڈ کرسکیں (محفوظ کرسکیں) انھی چیزوں کو مطالعے کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح لسانیات میں بھی ہم صرف ان کلمات یا آوازوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کو واقعی سنا جاسکے اور باضابطہ انھیں مشینوں میں محفوظ کیا جاسکے۔ صرف محسوسات اور Feeling کی بنیاد پر ہم کسی معروضی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ یہی

وجہ ہے کہ لسانیات میں تحریر کی بجائے تقریر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کیوں کہ لکھنے میں بہت سارے حروف زائد ہوتے ہیں لیکن تقریر میں استعمال ہونے والے سارے الفاظ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

سائنس کا یہ اصول ہے کہ کسی بھی چیز کے سلسلے میں تحقیق کرنے سے قبل ہم پہلے چند عارضی مفروضات قائم کرتے ہیں۔ ان مفروضات کو ایک ترتیبی شکل دیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق اپنے مطالعے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کئی طرح کے تجربے کیے جاتے ہیں اور جب اس کی تصدیق مکمل ہو جاتی ہے تو اپنے نظریے کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ یعنی ان مفروضات کے صحیح یا غلط کا فیصلہ یہیں پر ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح لسانیات میں بھی بولنے والے کی زبان کا مشاہدہ کرکے اس کے عارضی نتائج کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یہ تصدیق فونیٹک لیب یا لینگویج لیب میں ہو سکتی ہے یا پھر کسی مخصوص، لسانی گروہ کی بولیوں کے ذریعے بھی ماہر لسانیات اپنے نظریات کی تصدیق کر سکتا ہے۔ یہ تصدیق باضابطہ تجربہ گاہ (Laboratory) میں کی جاتی ہے۔ یہ تصدیق مکمل نہ ہونے پر ان مفروضات کو رد کر دیتے ہیں اور دوسرے مفروضات لے کر پھر تحقیق کرنا شروع کر دیتے ہیں۔[8]

خالص سائنس سے متعلق خصوصاً یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہ اپنا نظریہ خود بناتی ہے اور اسی پر اپنی باتوں کو جانچتی اور پرکھتی ہے۔ یہ کسی دوسرے علم پر منحصر نہیں ہوتی۔ موجودہ دور میں لسانیات کا مطالعہ بھی بہت حد تک انھی خوبیوں کا حامل ہے۔ اگرچہ زمانہ ماقبل میں اس کا مطالعہ صرف زبان تک محدود نہ تھا، اس کا استعمال زبانوں کو سدھارنے اور تقریر و تحریر کو بہتر بنانے کے لیے بھی کیا جاتا تھا۔

حواشی:

1. گیان چند جین — لسانی مطالعے، ص-16
2. علش درانی — اردو زبان اور یورپی اہل قلم، ص-14
3. عین الحق فریدکوٹی — اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص-43
4. مرزا خلیل احمد بیگ — لسانی تناظر، ص-21
5. اقتدار حسین — لسانیات کے بنیادی اصول، ص-14
6. ایضاً، ص-13
7. مرزا خلیل احمد بیگ — لسانی تناظر، ص-22
8. اقتدار حسین — لسانیات کے بنیادی اصول، ص-15

پتہ:
Department of Urdu
Kidderpore Collge,
2/3, Pitamber Sircar Lane,
Kidderpore, Kolkata-700023

□□□

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورّخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبر نامہ'' کے ساتھ ساتھ ملّا عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملّا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبر نامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620،

قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

امتیاز وحید

فاصلاتی تدریس و تعلیم کا تاریخی پس منظر

فاصلاتی تدریس (Distance Teaching) اور فاصلاتی تعلیم (Distance Education) قدرے جدید اصطلاحیں ہیں۔ 1971 کے اوائل تک یہ اصطلاحیں ناپید تھیں۔ طریقۂ تدریس کی توضیح و تفہیم کے لیے مراسلاتی تعلیم (Correspondence Education) کی اصطلاح رائج تھی۔ اس زمانے میں تعلیمی نشریات (Educational Broadcasting) یعنی اطفال اور بالغ طلبہ کی تدریس کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی اصطلاح پر بھی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔ اوپن لرننگ (Open Learning) کی اصطلاح سے بھی اس عہد کا تعلیمی سماج واقف ہوا چاہتا تھا جس کا استعمال اس مخصوص نہج کی افہام و تفہیم کے لیے کیا جاتا تھا جس میں جدید اوپن یونیورسٹی کے طلبہ حصول علم کے لیے جاتے تھے اور اس نکتے پر زیادہ زور دیا جاتا تھا کہ طلبہ "جب" اور "جہاں" چاہیں مطالعہ کریں۔ بعد میں یہ تمام اصطلاحیں "سہ نوعیتی طریق تدریس" (Three-way Teaching) کی جامع اصطلاح میں سمٹ آئیں جس میں خط و کتابت کورس، براڈ کاسٹنگ، اور وقتاً فوقتاً روبرو ٹیوشن (Occasional face-to-face tutiotion) جیسے پہلوؤں کا احاطہ مقصود تھا۔ چند برسوں بعد۔ اس نوع کی تعلیم میں جب بین الاقوامی دلچسپی بڑھی تو فاصلاتی تعلیم کی اصطلاح مروج ہوگئی غالباً اس کی وجہ یہ رہی کہ فرنچ لفظ tele-enseignment اور جرمن لفظ "Frenstudium" کا براہ راست ترجمہ ہے اور بقول ٹی ڈوڈس "فاصلاتی تدریس کی یہ ایک تسلی بخش تعریف ہے"

تعلیم بذریعہ خط و کتابت/مراسلاتی تعلیم، نشریاتی تعلیم اور وقتاً فوقتاً روبرو ٹیوشن جیسے خالص تعلیمی تصورات نے برسوں میں جداگانہ طور پر ترقی کے مراحل طے کیے ہیں۔ ان تعلمی تصورات میں باہم ربط و تعلق اور ان کی تاریخی صورتِ حال پر گفتگو یقیناً دلچسپ ہوگی۔

1. مراسلاتی تعلیم: انسان نے جب سے ہوش سنبھالا، پڑھنا اور لکھنا سیکھا تبھی سے خط و کتابت کے توسط سے معلومات اور علم و آگہی کی ترسیل کی روایت موجود ہے۔ مسیحی روایت کے مطابق مذہبی تعلیم پہ ایس ڈی پاؤل کے خطوط سب سے قدیم اور اہم ترین جدوجہد کا پتہ دیتے ہیں، اسلامی تاریخ میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے بذاتِ خود دور دراز علاقوں میں آباد اپنے ماننے والوں اور متعدد ممالک کے امرا و سلاطین کو اپنا پیغام خطوط کے ذریعے ہی پہنچایا۔ تاہم منظم مراسلاتی تعلیم کا تصور انیسویں صدی کی دین ہے۔

اس انوکھے تعلیمی تصور نے مختلف ممالک میں تقریباً ایک ساتھ اپنا سفر شروع کیا۔ 1830 میں سوئڈن میں اولاً میلر (Meiller) اور معاً بعد ہنس ہرموڈس نے ان طلبہ کو تعلیم دینا شروع کیا جو اسکول چھوڑ کر ایسی جگہ منتقل ہو گئے تھے جہاں سے وہ مستقل طور پر تعلیمی تسلسل جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ تعلیم خط و کتابت کے ذریعے ممکن تھی لہٰذا خطوط کی شکل میں ان طلبہ کو مواد فراہم کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ گھر پر ہی مطالعہ اور مشق کریں اور اسباق مکمل کر کے استاد کو بھیج دیں تا کہ ان پر ضروری اصلاح دے کر ڈاک سے دوبارہ طلبہ کو واپس کر دیا جائے۔ اس سے ایک طرف جہاں غلطی کی نشاندہی مقصود تھی وہیں طلبہ کو یہ بھی بتانا تھا کہ انھیں کن پہلوؤں پر مزید محنت درکار ہے۔ ٹھیک اسی عرصے میں انگلینڈ میں اساک پٹمین نامی شخص نے تقریباً اسی منہج تعلیم کو اپنایا۔ دونوں نے کھاتہ نویسی (Book keeping) اور دوسرے کاروباری مضامین سکھانا شروع کیے ان کی محنت رنگ لائی اور ایک اہم تعلیمی مرکز کا قیام عمل میں آیا جو ہنوز قائم ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے انھوں نے پرائیویٹ مراسلاتی کالجوں کے قیام کا طریقہ بھی اپنایا جو ایک صدی تک سارے یورپ میں چھایا رہا۔ مراسلاتی تعلیم کی ساکھ کو عام کرنے میں یہ طریقہ نہایت کارگر ثابت ہوا۔

1873 کے مورل ایکٹ کے نتیجے کے بطور امریکہ میں انیسویں صدی کی آخری دہائی میں یونیورسٹی ایکسٹنشن سروسیز ڈیپارٹمنٹ میں حوصلہ بخش ترقی ہوئی۔ نتیجتاً متعدد امریکی یونیورسٹیوں نے مراسلاتی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کی پیش کش شروع کی۔ سوئڈن اور امریکہ میں اس طریق تعلیم کے فروغ کا بنیادی محرک ان طلبہ تک رسائی حاصل کرنا تھا جو روایتی اسکول اور کالج سے پرے دور دراز علاقوں میں آباد تھے۔ بڑے رقبے، قلیل اور بکھری آبادی والے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں یہ تجربہ خوب رہا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پبلک سیکٹر میں یہ دونوں ممالک تیزی سے دیہی علاقوں میں آباد طلبہ کو تعلیمی سہولت بہم پہنچانے کی طرف مائل ہوئے۔ آسٹریلیا میں فاصلاتی سسٹم کی زیادہ پذیرائی ہوئی۔

1917 میں روسی انقلاب کے بعد، حکومت کی ترجیحات میں تعلیم کو عام کرنا بھی تھا۔ یہ ہدف اسکول سے یونیورسٹی اور پھر سوویت روس کے طول و عرض میں پھیلی جملہ انسانی آبادی تک علم و آگہی کی ترسیل کا تھا۔ یہ ماحول فاصلاتی تعلیم کے لیے بالکل سازگار تھا۔ 1920 میں خط و کتابت کورس یونیورسٹی میں ڈگری سطح پر متعارف کرائے گئے۔ ابتدائی اور ثانوی درجوں کی سطح پر بھی اسی

طرح کی کوششیں کی گئیں جو بارآور ثابت ہوئیں۔ 1963 کے آتے آتے روس کے تقریباً 2.4 ملین عوام مراسلاتی نظام تعلیم سے وابستہ ہو چکے تھے۔

حصولِ آزادی کے فوراً بعد تیسری دنیا کے ممالک میں تعلیم کو عام کرنے کی ناگزیر ضرورت نے فاصلاتی تعلیمی نظام کی معنویت اور ضرورت کو دو چند کردیا۔ 1960 کے دہے میں ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے ڈگری اور ماقبل ڈگری سطح کے خط و کتابت کورس کے شعبے قائم کیے۔ اسی طرح افریقی ممالک نے 1960 اور 1970 کے درمیان خط و کتابت کورس کو اساتذہ کی تربیت اور طلبہ کی مختلف تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بخوبی استعمال کیا۔

1962 اور 1969 میں INADES اور INCE جیسے اداروں نے بالترتیب ابتدائی سطح پر کسانوں اور موٹر کاریگروں کے لیے Vocational Training کا اہتمام کیا جو نتیجہ خیز رہا۔ مغربی افریقہ اور وینزویلا کے یہ دونوں مراسلاتی تعلیمی ادارے بے مثال خوبیوں سے متصف ہیں۔

محض ایک صدی میں "مراسلاتی نظامِ تعلیم" کا استعمال نہ صرف متعدد ممالک میں عام ہوا ہے، مختلف سطحوں پر متنوع مضامین نے اس کے دامن میں جگہ پائی ہے بلکہ طلبہ کے متعدد طبقوں نے وسیع پیمانے پر اس سے اپنا مستقبل وابستہ کرلیا ہے۔

2. تعلیمی نشریات: انسانی آواز کا پہلا کامیاب ریڈیو نشریہ 1902 میں وجود میں آیا، اٹھارہ سال بعد 1919 میں یو ایس اے کے وسکانسن شہر میں پہلا تعلیمی پروگرام نشر کیا گیا۔ 1920 اور 1930 کے دہے میں متعدد ممالک بطور خاص یو ایس اے، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے ریڈیو کی مدد سے تعلیم بالغاں اور اسکولی سطح پر تعلیمی پروگرام کے تجربے کو آگے بڑھایا۔ حصولِ تعلیم کا یہ انوکھا طریقہ کافی پسند کیا گیا۔ اسی عرصے میں بی بی سی نے تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ اسکولی نشریات پر زور دیا اور ایک لاسلکی یونیورسٹی (Wireless University) کا تصور دیا۔ بالغوں کی تعلیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے متعدد سلسلہ وار ریڈیو نشریات کا تجربہ بھی بی بی سی نے شروع کیا۔ عالمی جنگ کے بعد چونکہ بی بی سی کی ترجیحات میں سیاسی اور دوسری جہات شامل ہونے لگیں لہٰذا "تعلیم بذریعہ ریڈیو" کا خاکہ منتشر ہونے لگا اور اسکول ریڈیو سے اس کا رشتہ خاصا کمزور ہوگیا۔

1939 میں کناڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن نے کسانوں کے لیے "ریڈیو فارم فورم پروگرام" کی شروعات کی جس میں ہفتہ واری پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا۔ کناڈا کے دور دراز دیہی علاقوں میں منتشر کسان طبقہ نے اس پروگرام کی مدد سے شعبۂ زراعت میں نہایت کفایتی عملی تعلیم حاصل کی اور زرعی میدان میں نہ صرف جدید تکنیک کے استعمال کا ہنر سیکھا بلکہ شرحِ پیداوار میں بتدریج اضافے اور فصل کو قدرتی آفات سے محفوظ رکھنے جیسے معاملوں میں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ پروگرام کناڈا میں تقریباً پچیس سال تک نشر ہوتا رہا۔

1947 میں دیہی ریڈیو فورم کی سمت میں ہندوستان نے ایک تجرباتی قدم اٹھایا جس نے محض چند برسوں میں یونیسکو کی توجہ اور امداد حاصل کرلی۔ اس پروگرام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ابھی بھی نشر کیا جارہا ہے اور سارے عالم میں پھیل چکا ہے۔ انھی خطوط پر 1964 میں افریقہ اور گھانا میں دیہی فورم قائم کیا گیا۔ 1960 کے آخری برسوں میں افریقہ میں عام روایتی ڈگر سے ہٹ کر ایک "ریڈیو کلب" کا آغاز کیا گیا جس میں عام سامعین کے خیالات اور ان کے مشوروں کو زیادہ اہمیت دی گئی اور کوشش کی گئی کہ دیہی خطوں سے حاصل شدہ معلومات اور انھیں درپیش مسائل کو پروگرام میں شامل کیا جائے۔

ہندوستان اور کناڈا کے طرز پر کولمبیا نے ریڈیو پروگرام کا آغاز کیا جس نے اگلے پچیس سالوں میں اتنی ترقی کرلی کہ اس کی مقبولیت لاطینی امریکہ تک پھیل گئی اور یہ Radiophonic Schools کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کولمبیائی پروگرام میں کسان اگرچہ بطور ہدف شامل تھے مگر پروگرام کا زیادہ زور روایتی نوعیت کے تعلیمی مواد مثلاً پڑھنا، لکھنا اور ریاضی وغیرہ پر تھا جس کا مقصد اسکولی طلبہ کے طرز پر بالغ طبقے کو تعلیمی سرگرمیوں سے جوڑنا تھا اور جس کی مانگ دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ 1969 اور 1975 کے دوران "تنزانیہ" میں ایک "ریڈیو اسٹڈی گروپ مہم" شروع کی گئی۔ یہ ریڈیائی سیریز مختصر ضرور تھی مگر نہایت منظم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اس نے بلا مبالغہ 2.5 ملین یا تین ملین دیہی بالغ افراد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

فاصلاتی تعلیم کے سلسلے میں ٹیلی ویژن کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن نے بھی عام انسانوں تک پہنچ حاصل کی ہے، ٹیلی ویژن پر اسکولی نشریات اولاً انگلینڈ میں شروع ہوئے۔ پچاس اور ساٹھ کے دہے میں یہ تصور امریکہ اور سارے یورپ میں عام ہوتا چلا گیا۔ برطانیہ اور امریکہ کے متعدد تعلیمی مصلحین کو سماج میں ٹیلی ویژن کی مدد سے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کی امید نظر آئی۔ لہٰذا ٹیلی ویژن پر باصلاحیت اساتذہ مہیا کرائے گئے اور یورپ کی طلبہ برادری بطور خاص پس ماندہ دیہی علاقوں کے طلبہ کو ان قابل اساتذہ سے براہ راست تعلیم و تعلم کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس جد و جہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے پیمانے پر سلسلہ وار ٹیلی ویژن اسکول پروجیکٹس بنائے گئے اور ٹیلی ویژن کو اہم تدریسی کردار نبھانے کے لیے مختص کردیا گیا۔ اس نوعیت کا پہلا تجربہ 1957 میں USA میں کیا گیا ما بعد 1964 میں امریکی Samoa پروجیکٹ سامنے آیا مگر بڑے پیمانے پر اساتذہ کی مخالفت کے سبب اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

3. روبرو ٹیوشن: روبرو ٹیوشن دراصل فاصلاتی تدریس کا حصہ نہ ہونے کے باوجود اس کے تدریسی نظام سے مربوط ہے۔ کیوں کہ روبرو ٹیوشن کا اہتمام موقع بموقع اور بسا اوقات مستقل طور پر فاصلاتی تدریس فراہم کرنے والے ہر ادارے کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ روبرو ٹیوشن کا طریقہ کار مختلف النوع جزوقتی روایتی تعلیم بالغان کے طرز پر رکھا گیا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں انیسویں صدی کے وسط سے ہی تعلیم بالغان کے طرز پر "ایوننگ کلاس" کے تصور کو ترقی ملی ہے۔ برطانیہ میں دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں گھر بیٹھے مختصر کورس (ہفتہ/دو ہفتہ پر مبنی) مخصوص نوعیت کے "اقامتی مراکز" قائم کیے جا رہے تھے۔ بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر قدرے طویل کورس (ایک/دو ٹرم یا کبھی ایک سالہ) کی شروعات کی گئی۔ بالغوں کے اسی طریقہ کار کو دیگر ممالک میں بھی آزمایا گیا۔

فاصلاتی نظم تعلیم کا جو جامع تصور ہے وہ ان اکائیوں میں باہم ربط و تعلق کا متقاضی تھا لہٰذا 1960 کے بعد امریکہ اور برطانیہ کے دور دراز علاقوں تک زیادہ جامع اور موثر تعلیم بہم پہنچانے کی خاطر جدید ذرائع ابلاغ بطور خاص ٹیلی ویژن، خط و کتابت کورس اور وقتاً فوقتاً روبرو ٹیوشن کو بہتر طور پر استعمال کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہونے لگا اور ساٹھ کے اوائل میں میڈیسن یو ایس اے کی Wisconsin Extension Services یونیورسٹی نے مذکورہ پہلوؤں پر مشتمل ایک مشترکہ پروگرام شروع کیا 1963 میں National Extension College کا قیام اوپن یونیورسٹی کے ایک نمائندہ پروجیکٹ کے بطور عمل میں آیا۔ اس سے تحریک پاکر برطانیہ میں 1969 میں ایک اوپن یونیورسٹی قائم ہوئی۔ جو اپنی افادیت کے لحاظ سے فاصلاتی تدریس کا بہترین بین الاقوامی ادارہ ہے۔ ستر اور اسی کے دہے میں دنیا کے بیشتر ممالک میں اوپن یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ نئی دہلی کی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اس میدان میں بہ طور خاص سرگرم ہے جس کے ہزاروں تشنگان علم فیض اٹھا رہے ہیں۔

پتہ:

Mahanadi Hostel, 101-E, JNU, New Delhi

□□□

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

"کلیات راجندر سنگھ بیدی" — جلد دوم

مرتب: وارث علوی

راجندر سنگھ بیدی اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی تحریروں نے قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ "کلیات راجندر سنگھ بیدی" کی اس دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے "بے جان چیزیں" اور "سات کھیل" جن میں 11 ڈرامے ہیں، ان کے 29 مضامین جن میں انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات اور تنقیدیں ہیں اس کے علاوہ مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں جو اس کلیات میں شامل ہیں۔ بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون عمدہ ہے جو ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

صفحات — 655، قیمت — 380 روپے

اصغر علی انجینئر

دہشت پسندی کا مقابلہ

ساری دنیا آج دہشت گردی کا شکار ہے۔ ہم قدرتی طور پر اپنے ملک میں ہونے والی دہشت گردی سے زیادہ پریشان ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جو دہشت پسندی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ وجوہات چاہے مختلف ہوں۔ بہت سے ملکوں میں علاحدگی پسندی کی تحریک دہشت گردی کا سبب بنتی ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک نوآبادیاتی نظام کا ایک حصہ تھے۔ سامراجی قوتیں ان ممالک پر اپنا شکنجہ کسے ہوئے تھیں۔ ان قوتوں کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ مستقبل میں تعلیمی بیداری اور جمہوری تحریکیں نوآبادیاتی ممالک کے عوام میں سامراجیت کے پنجے سے نجات دلانے اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکنے کا حوصلہ پیدا کردیں گی اور جہاں جہاں ان کے حقوق تسلیم نہیں کیے جائیں گے، وہاں تشدد کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔

اسپین، جنوبی آئرلینڈ، شمالی اور شمال مشرقی سری لنکا، کشمیر، ناگالینڈ، آسام، تری پورہ، منی پور کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک میں علاحدگی پسند تحریکوں نے سر اٹھایا، ہنگامے ہوئے، بے شمار جانیں ضائع ہوئیں اور کروڑوں اربوں کی املاک تباہ ہوئی۔ نوآبادیاتی حکومتوں نے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اپنی تن آسانی کے لیے جو کچھ کیا تھا، موجودہ نسلیں آج اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں اور قیمت چکا رہی ہیں۔ اس فہرست میں امریکہ کے ان اقدامات کا اضافہ کرلیجیے جو اس نے تیل اور معدنیات کی ہوس میں تیسری دنیا اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ میں کیے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان امریکی اقدامات کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ لاکھوں کی تعداد میں بے گناہ عوام مارے گئے اور پورے پورے ملک مکمل طور پر تباہ و برباد ہوگئے۔ لیکن میڈیا جس پر طاقتور سرمایہ داروں کا قبضہ ہے، اس کی نظر میں تشدد کی جڑ اسلام ہے اور دہشت گردی اسلام کی سرشت میں شامل ہے۔ اپنے گناہوں کے جرائم کے لیے دوسروں کو ذمے دار قرار دینے کی یہ بدترین مثال ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک دہشت گردی کا علاج بھی بہت آسان ہے۔ دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ کیجیے، انسانی حقوق اور انسانی زندگی کی قدروقیمت کو جوتے کی نوک پر رکھ کر اچھال دیجیے، چند کٹھ پتلیاں تلاش کرلیجیے، کچھ ''مشکوک'' مسلم نوجوانوں کو دھر دبوچیے، انھیں جیل میں بند کرکے ان پر انسانیت سوز تشدد کیجیے، یہاں تک کہ وہ یا تو مر جائیں یا پاگل ہوجائیں اور آپ اپنے کو مستقبل میں ہونے والے حملوں سے محفوظ ہونے کا بلند بانگ دعویٰ کردیں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ، خون کی طرح چوکھا آئے۔ افسروں اور ذمے داروں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ جرم کس نے کیا، انھیں صرف ایک گردن چاہیے، جس میں وہ پھانسی کا پھندہ ڈال کر سرخ رو ہونے کا دعویٰ کرسکیں۔ انھیں پیسہ چاہیے اور اقتدار۔

ابھی حال ہی میں عالمی رائے عامہ نامی ادارے نے دنیا کے مختلف ممالک میں ایک سروے کیا تھا، جس میں اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو اذیت رسانی یا ٹارچر کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک موثر طریقہ مانتے ہیں۔ سروے میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو ریاست (پولیس) کے ذریعے دی جانے والی اذیت رسانی کو بند کرنے کی حمایت کرتے ہیں کہ یہ انسانی حقوق کی پامالی کی ارزل ترین شکل ہے۔ ہندوستانی عوام کی اکثریت نے ریاست یا پولیس کے ذریعے کی جانے والی اذیت رسانی کو ختم کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے دلیل دی کہ معصوم لوگوں کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے۔ 59 فیصد ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ دہشت گردی سے جنگ میں ٹارچر ضروری ہے۔

چودہ ممالک کے عوام نے ٹارچر کے طریقے کو ختم کرنے کی حمایت کی۔ چاہے اس میں ایسے دہشت گرد ہی کیوں نہ ہوں، جن سے ملنے والی اطلاعات بے گناہوں کی زندگیاں بچا سکتی ہیں لیکن چار ممالک کے عوام نے جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، دہشت گردوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت یا نرمی برتنے سے انکار کیا ہے۔ ادارہ عوامی رائے عامہ نے ''اذیت رسانی'' کے شکار افراد کے عالمی دن کے موقعے پر یہ سروے کروایا تھا، جس میں 19063 افراد نے حصہ لیا۔ ہندوستان میں 59%، نائیجیریا میں 54%، ترکی میں 51% اور تھائی لینڈ میں 44% لوگوں نے دہشت پسندوں سے نرمی برتنے کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ عام ملزموں کو ٹارچر نہیں کرنا چاہیے لیکن دہشت پسندوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اس موضوع پر دو مرتبہ سروے کروایا گیا۔ پہلا 2006 اور دوسرا 2008 میں۔ دو سال قبل ہندوستان میں 32% لوگوں نے دہشت گردوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی نرمی نہ برتنے یا انھیں ٹارچر کرنے کی حمایت کی تھی لیکن 2008 کے سروے میں یہ تعداد بڑھ کر 59% ہوگئی۔ لیکن

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے، جو چاہتے ہیں کہ اذیت رسانی اور ٹارچر کا طریقہ بالکل ختم کیا جانا چاہیے، خواہ ملزم کوئی بھی ہو۔ 2006 میں ایسے لوگوں کی تعداد 23% تھی جو 2008 میں بڑھ کر 28% ہوگئی۔ انیس ممالک کے عوام کی اکثریت نے ٹارچر کو ختم کرنے کی حمایت کی ہے۔ اوسطاً تمام اقوام کے 57% عوام نے صاف اور صریح طور پر اذیت رسانی کو بالکل ہی ختم کرنے کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ 35% نے فیصلہ دیا ہے کہ جب معصوم جانوں کو خطرہ ہو تو کچھ گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے اور صرف 9% نے حکومت اور پولیس کے ذریعے کی جانے والی اذیت رسانی کی حمایت کی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹارچر کو بالکل ترک کرنے کی حمایت کرنے والوں کا اوسط سب سے زیادہ اسپین میں ہے۔ یہاں 82% لوگوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی حالت میں ٹارچر کو ذریعۂ تحقیق نہ بنایا جائے۔ انگلینڈ کے 66%، فرانس کے 66%، میکسیکو کے 73%، چین کے 66%، فلسطینی علاقوں کے 66%، انڈونیشیا کے 61% اور یوکرین کے 59% عوام کی بھی یہی رائے ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دہشت گردوں کے مقابلے میں اذیت رسانی کی حمایت کرنے والوں کی شرح اتنی زیادہ کیوں ہے؟ جواب زیادہ مشکل نہیں۔

ہندوستان میں فرقہ پرست طاقتیں مسلسل اس بات کے پروپیگنڈے میں مصروف ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اسی وقت کامیابی ممکن ہے جب ٹاڈا اور پوٹا جیسے قوانین کا نفاذ کیا جائے اور ٹارچر کو بطور ایک ہتھیار کے آزادی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

دوسری وجہ بھی اسی سے متعلق ہے۔ میڈیا مسلسل پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ چونکہ اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے اس لیے دہشت گردی کا سبب اور ذمے دار بھی اسلام ہے۔ جب بھی کہیں کوئی بم پھٹتا ہے، اس سے قبل کہ اس کی آواز معدوم ہو، پولیس اعلان کر دیتی ہے کہ اس کے پیچھے حرکت الجہاد اسلامی اور سیمی کا ہاتھ ہے۔ پولیس یہ بیان اس لیے دیتی ہے کہ اس کی ذہنیت بھی ملک کے ماحول اور عوام کی اکثریت کی ذہنیت سے مختلف نہیں ہے۔

اس نظریے میں مزید اضافہ کر لیجیے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ملک میں ہندو مسلم جھگڑا جاری ہے جو برطانوی حکمرانوں کی سامراجیت کا نتیجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ملک میں انسانی حقوق کے تعلق سے عوامی بیداری انتہائی مایوس کن ہے اور انگریزوں کے زمانے سے پولیس کی اس جبلت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ ملزموں سے مار مار کر اور ان پر حد سے زیادہ ظلم و ستم کر کے ان سے ناکردہ گناہوں کا اقرار کروایا جائے۔

ہمارے ہندوستانی سماج میں فرقہ پرستی اور اقلیت دشمنی کی جڑیں اتنی گہری اتر چکی ہیں کہ اب انھیں اکھاڑ پھینکنا شاید ممکن نہیں۔ ایک طرف علمائے دارالعلوم دہشت گردی کے خلاف فتوے دے رہے ہیں اور لاکھوں کے اجلاس میں اس کی سخت مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف بال ٹھاکرے کی زبان زہر اگلتی ہے کہ ہندو نوجوانوں کو بھی اب انسانی بم بننا چاہیے۔ (شروعات اپنے گھر سے ہی کیوں نہیں کرتے؟)۔ بالفرض اگر ایسا ہوا بھی اور کوئی ہندو نوجوان انسانی بم بن کر مسلمانوں کی بستی میں پھٹ گیا تب بھی گرفتاری مسلم نوجوانوں کی ہوگی اور اذیت رسانی کی ساری حدیں انھی پر ختم کی جائیں گی۔

فرقہ پرستی کے زہر کا یہ عالم ہے کہ نئی ممبئی اور تھانے میں سناتن سنگھٹن کے اراکین جب بم دھماکوں کے الزام میں گرفتار کیے گئے تو ٹی وی پر ایک مباحثہ ہوا۔ اس میں ماڈریٹر نے مباحثے کے شرکا سے سوال کیا کہ سیمی کی طرح سناتن سنگھٹن پر پابندی لگانی چاہیے تو شرکا کی اکثریت نے انکار کیا۔ ان کے خیال میں کوئی ہندو تنظیم سیمی کی طرح وطن دشمن ہو ہی نہیں سکتی۔

سب سے زیادہ قابل افسوس حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے نام نہاد لیڈران عوامی مخالفت کے مفروضہ خوف سے فرقہ پرست پارٹیوں کا مقابلہ کرنے سے کتراتے ہیں اور بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جس سے شہ پاکر فرقہ پرستوں کے حوصلے دن بہ دن بڑھتے جاتے ہیں۔ بال ٹھاکرے کے زہر میں بجھے ہوئے مذکورہ بالا بیان کے بعد کسی بھی سیکولر پارٹی کے ایک بھی لیڈر کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس کی مذمت کرتا۔ ان لیڈران کو ساری فکر ووٹوں کی ہے۔ ملک اور ملک کا سیکولرازم جائے جہنم میں۔

امریکہ نے دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹارچر اور اذیت رسانی کی پالیسی اپنائی۔ ہزاروں لوگوں کو گرفتار کر کے گونتا مو کے قید خانوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ہزاروں معصوموں کی زندگیاں یا تو تلف ہوگئیں یا برباد ہوگئیں لیکن امریکہ کے لیے مسئلہ آج بھی ہے بلکہ اس کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ جب امریکا جیسا دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ طاقتور ملک بہ زور طاقت دہشت گردی پر قابو نہیں پاسکا تو ہندوستان یا کوئی اور ملک محض چند لوگوں پر اذیت دہی اور ٹارچر کے طریقے اپنا کر کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے؟ دہشت گردی اور دہشت پسندی سیاسی مسائل ہیں اس لیے ان کا سیاسی حل ہی ممکن ہے۔ پولیس کے ڈنڈے اور فوجی جوتے اس کا قطعی حل نہیں ہیں۔

دہشت گردی کا مطالعہ کرنے والے تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ امریکا دہشت گردی کے مسئلے کو حل کرنے میں بری طرح ناکام ہوا اور دہشت گردی کے خلاف اس کی نام نہاد جنگ نے افغانستان اور عراق اور دیگر ممالک میں ہونے والے دہشت گردانہ حملوں میں اضافہ کیا ہے۔ مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرنا اور عقوبت خانوں میں ان پر انسانیت سوز ظلم کرنے کی پالیسی بھی

بری طرح ناکامی کا شکار ہوئی ہے۔ اس کے باوجود امریکا مسئلے کے سیاسی حل کے لیے آمادہ نہیں۔ وہ اس علاقے میں اسرائیل کی پشت پناہی کرتا چلا آرہا ہے اور اگر فلسطین کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے تو اسرائیل بالکل تنہا پڑ جائے گا۔ اسی لیے فلسطین میں امن کی سنجیدہ کوشش نہیں کی جارہی ہے۔

ہندوستان میں بھی دہشت پسندی کا مسئلہ دیگر بے شمار مسائل سے جڑا ہوا ہے۔ یہ سوچنا اور سمجھنا کہ اس کے ذمے دار صرف اسلام اور مسلمان ہیں، انتہائی درجے کی کوتاہ بینی ہوگی۔ یہی اور بچی پر الزام عائد کرکے پولیس اپنی ناکامیوں اور ناکارکردگی پر پردہ ڈال دیتی ہے اور بے گناہ مسلم نوجوانوں پر ظلم وستم کو کارنامہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ حکومت ہند جتنی جلد اسے سمجھ لے اتنا ہی بہتر ہوگا قوم کے لیے۔ ورنہ یہی ہوتا رہے گا کہ دہشت گردوں کے حملے جاری رہیں گے، معصوم عوام مرتے رہیں گے اور بے گناہ مسلم نوجوانوں کو عقوبت واذیت کی سرد وتاریک راہوں سے گزارا جاتا رہے گا اور مسئلہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔

آج تک پولیس بم دھماکوں کے اصل مجرمین تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اپنا کام انجام دینے کے بعد مجرمین بڑے آرام سے فرار ہوجاتے ہیں۔ حیدرآباد بم دھماکوں کے بعد پولیس نے معمول کے مطابق مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا۔ ان میں زیادہ تر نچلے طبقے کے نوجوان تھے۔ کوئی رکشہ چلاتا تھا، کوئی سبزی کا ٹھیلہ لگاتا تھا تو کوئی دیگر چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ پولیس نے انھیں گرفتار کرکے جیلوں میں بند کردیا اور انھیں ناقابل بیان جسمانی اذیتیں دیں۔ وہ سب کے سب بے گناہ تھے اور عوام نے جب پولیس کے خلاف مہم چلائی تو ان میں سے نصف کو ضمانت پر چھوڑ دیا گیا لیکن تقریباً نصف تعداد آج بھی جیلوں میں سڑ رہی ہے۔ پولیس کا نشانہ عموماً وہ غریب اور مفلس مسلم نوجوان ہوتے ہیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی سیاسی یا سماجی لیڈر نہیں ہوتا۔ یہ بے چارے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے اور پولیس کو بغیر کسی دقت کے انسانی شکل میں قربانی کے بکرے مل جاتے ہیں۔

جے پور میں بھی یہی ہوا، دھماکوں کے بعد مفلس غریب مسلمان نوجوانوں اور ائمہ کو پکڑا گیا، انھیں ٹارچر کیا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ آخر یہ کب تک چلتا رہے گا؟ دھماکوں کے اصل مجرمین تو پولیس کی پہنچ سے دور کہیں بیٹھے قہقہے لگا رہے ہوتے ہیں اور ان قہقہوں کی قیمت خون اور آنسو کی شکل میں بے گناہ مسلمان ادا کرتے ہیں۔ پولیس کی فرقہ پرستانہ ذہنیت اور تنگ نظری مسئلے کو حل کرنے کی بجائے اس کی شدت میں اضافہ کردے گی۔ میں اس بات کا حامی ہوں کہ جمہوری ہندوستان میں، اذیت رسانی اور ٹارچر کی کوئی جگہ نہیں، انسانی حقوق سب سے زیادہ قابل احترام ہیں۔

ٹارچر صرف ان ناکارہ پولیس افسروں کی مدد کرتا ہے جو جرم کی ایماندارانہ تحقیقات سے جان چراتے ہیں۔ ان کا نکما پن اور فرقہ پرست ذہنیت ایک ایسی آڑ بن جاتی ہے، جس کے آگے وہ دیکھ نہیں سکتے۔ ایک ایماندار اور قابل پولیس افسر ملزم کے خلاف ایسے ثبوت اکٹھے کرتا ہے جو ٹھوس اور ناقابل تردید ہوتے ہیں۔ ہمارا عدالتی نظام بھی اذیت رسانی کے اس جرم میں مددگار ہے کیونکہ اس نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ پولیس زیر حراست ملزمین پر "کچھ حد تک" تشدد کرسکتی ہے۔ 22 جون 2008 کو جے پور میں "سماج، ریاست اور دہشت گردی" کے عنوان سے ایک سیمینار ہوا تھا۔ اس سیمینار میں سابق سیشن جج مسٹر باجوا نے جب اس حقیقت کو "عدالتی دہشت گردی" کا نام دیا تو حاضرین اور شرکا میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ حکام اور عمائدین کو جلد ہی ان مسائل کا احساس ہوگا اور وہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی ایک مناسب پالیسی بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے اگرچہ مسئلہ جتنا پیچیدہ ہے اسے دیکھنے کا نظریہ بھی اتنا ہی پیچیدہ ہے۔

□□□

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی وسیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت: -/33 روپے

سید احمد قادری

بہار کے اوّلین اردو اخبار

بہار میں صحافت کی ابتدا اردو سے ہی ہوئی، کہا جاتا ہے کہ پہلا اردو اخبار ''نورالانوار'' آرہ سے نکلا۔ (جولائی 1853)، دوسرا ''پٹنہ ہرکارا'' (21 اپریل 1855 پٹنہ سے)، تیسرا ''ویکلی رپورٹ'' (یکم مئی 1856 گیا سے) اور چوتھا ''اخبار بہار'' (یکم ستمبر 1856 پٹنہ سے)۔

''نورالانوار'' کے متعلق سید محمد اشرف نقوی نے ''اختر شہنشاہی'' میں لکھا ہے:

''نورالانوار، آرہ، ضلع شاہ آباد، محلہ پھاٹک سادات بلگرامی، مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اثنا عشری، مہتمم سید خورشید احمد اثنا عشری، اجرا جولائی 1853''۔

(سوانح عمری اخبارات، حصہ اوّل، اختر شہنشاہی، لکھنؤ 1888، صفحہ 5-)

اسی اطلاع کو بنیاد بنا کر کئی محققین نے اس اخبار کا ذکر کیا ہے، لیکن شاید کسی نے اس اخبار کو دیکھا تک نہیں ہے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال نے ''بہار میں اردو نثر کا ارتقا'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''اختر شہنشاہی میں اخبارات اور مطابع کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے اور انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف اختر شہنشاہی نے ''نورالانوار'' مطبع کا ذکر کیا ہے، جسے رخشاں ابدالی اور عتیق صدیقی نے غلط طور پر اخبار سمجھ لیا ہے۔''

امداد صابری نے ''تاریخ صحافت'' میں ''نورالانوار'' کے متعلق کسی طرح کی کوئی رائے نہیں دی ہے۔ ''ہندوستانی اخبار نویسی'' (کمپنی کے عہد میں) میں عتیق صدیقی نے پورا ایک باب بہ عنوان ''اٹھارہ سو ستاون اور اخبارات'' تحریر فرمایا ہے لیکن اس پورے باب میں بہار کا ذکر نہیں ہے۔ عتیق صدیقی کی ایک دوسری کتاب ''اٹھارہ سو ستاون ـــ اخبار اور دستاویز'' میں 20 اخبارات کا تذکرہ ہے لیکن اس فہرست میں بھی بہار کا کوئی اخبار شامل نہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب ''صحافت پاکستان و ہند میں'' میں روزناموں کی ابتدا کے باب میں'' (صفحہ -164) 1876 میں پٹنہ سے جاری ہونے والے ایک اردو روزنامے ''انیس بہار'' کا ذکر ملتا ہے۔ نادر علی خاں نے ''اردو صحافت کی تاریخ'' میں کئی صوبوں اور شہروں کی صحافت پر روشنی ڈالی ہے، لیکن بہار کی صحافتی خدمات کا ذکر انھوں نے بھی نہیں کیا ہے۔

''نورالانوار'' کے بارے میں اختر شہنشاہی کی اطلاع کو درست مان لیا جائے تو بہار 1853 سے 1857 تک بہار کے چار اخبارات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بہار کا دوسرا اخبار ''پٹنہ ہرکارا'' ہے جس کے متعلق مظفر اقبال لکھتے ہیں:

''پٹنہ ہرکارا، پٹنہ بہار یہ 3 شعبان 1271ھ یعنی 21 اپریل 1855 یہ اخبار 'کٹرہ کھرد دھرلعل' علاقہ تھانہ گھاٹ، خواجہ کلاں متحلات شہر پٹنہ سے مہینے میں تین بار (انگریزی کلنڈر کی پہلی، گیارھویں اور اکیسویں کو) شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور مہتمم شاہ ابوتراب تھے، اڈیٹر کا نام درج نہیں ہے لیکن قیاس یہ ہے شاہ ابوتراب ہی ایڈیٹر بھی ہوں گے۔ اس کے چھ شمارے کتب خانہ خدا بخش خاں، پٹنہ میں محفوظ ہیں۔''

''پٹنہ ہرکارا'' کا ہر شمارہ 21X28 س.م. سائز کے 12 صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحۂ اوّل پر ایک ہلال بنا ہوا ہے جس میں اردو اور انگریزی میں اخبار کا نام اور سن اجرا یعنی 1855م 1271ھ درج ہے۔ باقی صفحات دو کالم پر مشتمل ہیں۔

''اس اخبار میں مضامین، لطیفے بہ عنوان نقل، سرکاری احکام اور ملازمان سرکار کی بحالی اور تبادلے کی خبریں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ اپنے مندرجات کے اعتبار سے یہ اخبار ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خیرخواہ معلوم ہوتا ہے، لیکن تبلیغ عیسائیت کا شدید مخالف تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف اس میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ خبریں زیادہ تر ہم عصر اخبارات سے نقل کی جاتی تھیں۔ یوں اخبار کے اپنے نمائندوں کی مرسلہ خبریں بھی چھپتی تھیں۔

اپنے نمائندوں کو اخبار نے ''مخبر'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ اخبار یکم مارچ 1856 تک جاری رہا۔''

(سووینیر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس، پٹنہ 1972، صفحہ 8-7)

اس اخبار کے چند مندرجات کے مطالعے سے اس کی زبان و بیان اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی خیرخواہی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دو اقتباسات:

''قبل اس کے اشتہار دیا گیا تھا کہ تین پیانہ کبیر الاخبار مقام کٹرہ کھرد دھرلعل علاقہ تھانہ گھاٹ خواجہ کلاں متحلات شہر پٹنہ باہتمام سید شاہ امید علی بزبان اردو طبع ہوکر خدمت میں ناظرین اخبار کے پہنچا کرے گا اور قیمت اس کاغذ کی ایک روپیہ ماہواری اور بطور پیشگی سالانہ نو روپیہ لیا جائے گا، مگر شاہ امید علی مہتمم نے قبل اجرائے کاغذ کبیر الاخبار کے بتاریخ ششم صفر 1371ھ سفر آخرت اختیار کیا۔ اس سبب سے اس قدر توقف اجرائے اخبار میں ہوا۔ الحال اشتہار دیا جاتا ہے کہ نام اس اخبار کا پٹنہ ہرکارا (کذا) مقرر کیا گیا اور ہر مہینے انگریزی کی پہلی اور گیارھویں اور اکیسویں تاریخوں کو اخبار بزبان اردو جس میں خبریں ہفت اقلیم کی اور آئین اور قانون اور تبدیلی اور بحالی و رخصت و

معزولی حکام اور علاوہ اس کے اشعار و لغز و حکایات نادرہ اور اصول ہر علم و فنون طبع ہوا کریں گے اور سوائے اس کے کتابہائے ہر علوم مع تصویر و بے تصویر طبع ہو کر فروخت ہوگی۔ چنانچہ بالفعل نسخۂ چہار گلزار طبع ہوتی (کذا) ہے۔ واضح ہو کہ جو خبر مثل ہجو کسی شخص کے جس میں تذلیل و تحقیر کسی کی ہو ہرگز طبع نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے کہ جو خبر ایسی صحیح کہ وقوع اس واقع کا بلا تشکیک و تمہید ہو۔ چند دہ مجہول ہو اور پر قدح یا مدح کے چار و ناچار طبع ہونا اس کا ضرور ہوگا۔"

(خدا بخش جرنل 81-83، صفحہ -55، بحوالہ پٹنہ ہرکارا)

"پٹنہ ہرکارا" کی پرنٹ لائن (جو آخری صفحے کی آخری سطر میں ہے) سے خواہ مخواہ یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ اخبار دراصل "اخبار الکبیر" کا ضمیمہ ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ "اخبار بہار"، "اخبار الکبیر" کا دوسرا نام ہے جسے نکالنے کا پروگرام بنا تھا، جو شاید امید علی، مہتمم کے انتقال کی وجہ سے ممکن نہ ہوسکا۔" (خدا بخش جرنل 81-83، صفحہ -60، بحوالہ پٹنہ ہرکارا)

دوسرا اقتباس، جو کمپنی سرکار کی خیر خواہی اور ہمنوائی کا مکمل ثبوت فراہم کرتا ہے اور حاکم کی خفگی، کمپنی سرکار کی ہتک اور نقصان کی فکرمندی کا احساس دلاتا ہے۔ "پٹنہ ہرکارا" لکھتا ہے:

"اسی سبب سے حرمان متوسلین مخوف رہی کہ حاکم، اخبار نویس سے پوچھ بیٹھی کہ یہہ خبر تم کو کہاں سے ملی جو مندرج اخبار کیا، تو اس وقت ایسا نہو کہ حاکم تصور کری ایں ہم بچہ شتر یت وحال آنکہ یہہ تصور مخبر کا غلط ہے کیونکہ جو واقعہ صحیح و بلا تمہید نسبت رعایا یا حکام کی ہو اوسکے لکھنی میں کچھ قباحت نہیں ہی مگر ہمکو وہ بات نہیں لکھنا چاہئے جس میں کسے طرح کا نقصان سرکار یا ہتک کے حاکم کی برخلاف وقوع کی ہو۔" ("پٹنہ ہرکارا" 21 جون 1855)"

"پٹنہ ہرکارا" میں احکام گورنمنٹ کے تحت احکام جناب لیفٹیننٹ گورنر بنگالہ... (جلد اوّل، یکم جون 1855) یا احکام دیوانی، کلکتہ... (یکم جون 1855) وغیرہ بھی شائع ہوئے تھے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ اخبار پوری طرح کمپنی سرکار کے زیر اثر تھا، یا پھر کمپنی سرکار کی ایما پر ہی شائع ہو رہا تھا۔ جیسا کہ ولیم ٹیلر (کمشنر پٹنہ ڈویژن) کا نام "اخبار بہار" سے منسلک کیا جاتا ہے۔

بعض معتبر محققین نے جیسے قاضی عبدالودود یا ڈاکٹر مظفر اقبال، "پٹنہ ہرکارا" کو "پٹنہ ہرکارہ" لکھا ہے جبکہ خدا بخش لائبریری میں موجود "پٹنہ ہرکارا" کی فائل دیکھنے کا دعویٰ قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر مظفر اقبال دونوں نے کیا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اخبار کے اندرونی صفحات پر "پٹنہ ہرکارہ" لکھا ہوا ہے، لیکن جہاں تک اخبار کا نام ہے ہر شمارے کے سرورق پر بہت ہی صاف تحریر میں "پٹنہ ہرکارا" اور انگریزی میں "PATNAH-HURCARA 1855" درج ہے۔

خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائریکٹر اور خدا بخش لائبریری جرنل 81-83 کے ایڈیٹر عابد رضا بیدار نے بھی اس جانب توجہ نہیں دی، ورنہ وہ مذکورہ جرنل میں قاضی عبدالودود کے مقالات میں اس غلطی کی جانب اشارہ کرسکتے تھے۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مقالے "پٹنہ ہرکارہ" (معاصر 43-1942۔ چند اہم اخبارات و رسائل اور خدا بخش جرنل -81-83) میں اخبار کے جو اقتباسات دیے ہیں، وہ کس شمارے اور کس صفحے سے اخذ کیے ہیں، اس کا کوئی حوالہ نہیں ہے، اقتباسات کی نقل بھی مطابق اصل نہیں ہے۔ مثلاً "پٹنہ ہرکارا" کے یکم مئی 1855 کے شمارے کے صفحہ -11 پر تحریر اس طرح ہے:

"پٹنہ ہرکارہ": ناظرین اخبار ظاہر ہے کہ اس امر میں کوئی را احکام کو...صادر نہیں ہوا۔ جیسا کہ زبان زد عوام ہی، بلکہ اکثر خواص بھی وہی اعتقاد رکھتی ہیں کہ سرکار بلند اقتدار نے اب تک کوئی زبردستی بہ نسبت رعایا نہیں فرمائی بلکہ ہمیشہ عدل و انصاف ہی رہا...اور یہی باعث تھا کہ قیام سلطنت تاہنوز باقی نہ بچا۔"

اس اقتباس کو قاضی عبدالودود نے اس طرح نقل کیا ہے: "پٹنہ ہرکارہ" کی رائے: سرکار نے اب تک کوئی زبردستی بہ نسبت رعایا نہیں فرمائی بلکہ ہمیشہ عدل و انصاف ہی رہا...اور یہی باعث تھا کہ قیام سلطنت تاہنوز باقی ہے۔"...

(چند اہم اخبارات و رسائل: قاضی عبدالودود صفحہ :57، سطر 13-12)

اس اخبار میں زیادہ تر خبریں دوسرے اخبارات مثلاً اخبار آگرہ، الحقائق، دوربین، آفتاب ہند، بنارس اور بنگال ہرکارا وغیرہ سے اخذ کی جاتی تھیں۔ اپنی خبر مخبر کی اطلاع کے طور پر دی جاتی تھی۔ اس اخبار کے معیار کے متعلق قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ:

"پٹنہ ہرکارہ" کسی نقطۂ نظر سے اچھے اخباروں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔"

(خدا بخش جرنل 81-83، صفحہ -54)

بہار کا تیسرا اور گیا کا پہلا اخبار "ویکلی رپورٹ" یکم مئی 1856 کو منظر عام پر آیا۔ اس کی اطلاع بھی اختر شہنشاہی نے دی ہے، جو اس طرح ہے:

"ویکلی رپورٹ، صاحب گنج، گیا، ماہوار، 24 ورق خورد مالک منشی جے۔جے۔ رام مختار، ترجمہ ویکلی رپورٹ از مطبع راسو پریس، اجرا یکم مئی 1856۔" (اختر شہنشاہی، صفحہ 11)

اختر شہنشاہی کی اطلاع کے مطابق یہ اخبار "ویکلی رپورٹ" (انگریزی) کا ترجمہ تھا۔ اس اخبار کا ذکر عتیق صدیقی نے بھی اپنی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" کے صفحہ 458 پر کیا ہے۔ دوسری کئی جگہوں پر بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اب تک کسی نے اسے دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ میں نے خود گیا کلکٹریٹ اور ضلع لائبریری میں کافی تلاش کیا لیکن اس کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس لیے اس اخبار کی زبان و بیان، اس کی پالیسی، وغیرہ کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہوں۔ ڈاکٹر مظفر اقبال بھی بس اختر شہنشاہی کی رائے پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ویکلی رپورٹ" گیا بہار یکم مئی 1856: اختر شہنشاہی کی اطلاع کے مطابق یہ ایک ماہنامہ تھا جو راسو پریس واقع صاحب گنج، گیا سے نکلتا ہے۔ یہ رام مختار کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ یہ چھوٹے سائز کے 24 اوراق پر مشتمل ہوتا تھا۔" (سووینئر آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس، پٹنہ 1972، صفحہ-8)

بعض لوگوں نے اسے بہار کا چوتھا اخبار لکھا ہے جبکہ تاریخ اشاعت کے اعتبار سے یہ بہار کا تیسرا اخبار ہے۔

بہار کے چوتھے اخبار "اخبار بہار" کا اجرا پٹنہ سے یکم ستمبر 1856 کو ہوا۔ ڈاکٹر مظفر اقبال اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"اخبار بہار" بہار یہ پٹنہ یکم ماہ ستمبر 1856۔ پٹنہ ہرکارہ کی طرح یہ اخبار بھی شاہ ابوتراب کے مطبع سے جاری ہوا تھا اور اسی کی طرح مہینے میں تین بار چھپ کر شائع ہوتا تھا۔ اس کی تاریخ اجرا یکم ستمبر 1856 ہے۔ اس کے ایڈیٹر لالہ بندا پرشاد متخلص بہ حسرتی، منشی مطبع مہتمم شاہ ولایت علی اور کاتب فتح بہادر تھے۔"

اس اخبار کے پہلے دو شماروں کے صفحۂ اول کی پیشانی پر صرف ایک ہلال بنا ہوا ہے جس میں اخبار کا نام اور اس کا سن اجرا یعنی 1856 درج ہے۔ تیسرے شمارے سے پیشانی کی تحریر بدل گئی ہے اور اخبار کے نام کے ساتھ درج ذیل قطعہ ملتا ہے:

نہ ایں مضمون بر تو آشکار است
کہ درج صفحہ اخبار بہار است
بدیدن حال رنگیں دلفریبے
زعد مشتاق چشم روزگار است

شمارہ-6 سے اس کی جگہ پر ذیل کا قطعہ ملتا ہے جو پیش نظر فائل کے آخری شمارے یعنی جلد-6 کے شمارہ نمبر 21 تک موجود ہے:

جہاں بہ جان و دل خویشتن خریدار است
چہ جنس بیش بہا ایں متاع اخبار است
مرقعیست کو تصویر او ز اور نقش
بطرح تازہ ورنگی (کذا) دیگر نمودار است

یکم ستمبر 1856 سے 21 مئی 1857 تک اس اخبار کے 33 شمارے خانقاہ منیر شریف میں محفوظ ہیں۔ "پٹنہ ہرکارا" کی طرح اس اخبار میں بھی ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ اور سائز 21X28 سی م ہے۔ تعداد صفحات میں اختلاف ہے۔ بیشتر شمارے 8 صفحات پر مشتمل ہیں لیکن بعض بعض میں 12،10 اور 14 صفحات بھی ہیں۔ مندرجات میں مضامین، قوانین، سرکاری احکام اور عام خبروں کے علاوہ اداریے بھی ہیں۔ چند شماروں میں نظمیں اور غزلیں بھی مل جاتی ہیں۔ "پٹنہ ہرکارا" ہی کی طرح یہ اخبار بھی کمپنی کا خیر خواہ تھا، چنانچہ 1857 کے احوال و کوائف کو اسی انداز میں پیش کرتا ہے۔

دس صفحات پر مشتمل اس اخبار میں مختلف شہروں مثلاً خبر عظیم آباد، خبر رام پور، خبر بریلی، خبر فتحپور، خبر ناگپور، خبر افغانستان، وغیرہ وغیرہ کے ساتھ خبر عجیب، خبر سوپرم گورنمنٹ وغیرہ عنوانات سے خبریں شائع ہوتیں اور ہر شمارے کے پہلے صفحے پر "اشتہار متعلقہ مطبع" ہوتا۔

اخبار میں کمپنی سرکار کی تعریف و توصیف اور اس کی عنایات کا ذکر تفصیلی طور پر ملتا ہے۔ باغیوں کے لیے کسی بھی طرح کی ہمدردانہ رائے کے اظہار کے بجائے ان کے منفی پہلو کو اجاگر کرنے میں اخبار پیش پیش تھا۔ چند اقتباسات پیش ہیں:

"عنایات سرکار:۔ سرکار دولتمدار نے حکم دیا ہے کہ جس وقت کسی شاہزادہ کی یا کسی اور تنخواہ دار گورنمنٹ کی وفات کی خبر حکام مفصل کو معلوم ہو، فوراً دو سو روپئے خزانہ سرکاری سے بلا انتظار اجازت و منظوری گورنمنٹ، تجہیز و تکفین کے واسطے دیا کریں۔ سبحان اللہ کیا عنایات بے پایاں و الطاف بے کران ہی۔"

("اخبار بہار" یکم فروری 1857، صفحہ-10)

"29 مئی کو کلکتہ سے یہ خبر پہنچی کہ الہ آباد لکھنؤ میں کچھ فساد نہیں ہی اور لاہور سے یہ خبر آئی ہی کہ چاروں طرف سے فوج سرکاری پہنچ گئی اور دہلی کا محاصرہ ہوگیا اور اس مہینے کی 8 تاریخ سپاہیان باغی کی سزا دہی کے واسطے مقرر ہوئی، یقین ہے کہ باغیوں کو سزای اعمال مل گئی ہو۔"

(اخبار بہار" 11 جون 1857، صفحہ-5)

"خلاصہ قانون یازدہم 1857

جو شخص سرکار کے ساتھ بغاوت رکھتا ہو یا باغیوں کا ہمراز ہو یا مدد و معاون یا ایسا ذکر، جس سے اہانت سرکار کی ہوتی ہو در صورت ثبوت بحکم صاحب کمشنر بندوبست حسب صراحت ذیل موجب سزا ہوگا۔

نام جرم	تفصیل سزا
....	....

"..........

(جلد-2 شمارہ: 19 تاریخ یکم جولائی 1857، صفحہ-2)

"انگریزی پلٹن واسطے حفاظت خزانہ و جیلخانہ
کے گیا میں پہنچے ہیں راجہ ٹیکاری و سو وا ڈمراؤں وٹکارے
بھی اپنے اپنے سرحدوں میں مدد دینے کے لیے منتظر
اجازت سرکار ہیں۔"

(جلد-2 شمارہ: 19 یکم جولائی 1857، صفحہ-6)

1857 کی بغاوت کے دوران جو واقعات مختلف شہروں جیسے دہلی، گیا، عالم گنج، بنارس، ناگپور، کانپور، لکھنؤ، الہ آباد وغیرہ میں ہو رہے تھے ان کی خبریں

مخالفانہ انداز میں دی گئی ہیں۔ ہندوستانی عوام اور سپاہیوں کو بھی سرکاری احکامات کے اعلانات کی اشاعت کرکے خوفزدہ کرنے کی کوششیں ملتی ہیں مثلاً

"ان ہنگامہ پردازوں میں سے 31 آدمی گرفتار ہوئے اور مقدمہ ان کا بحضور صاحب کمشنر بنو بہادر ایک گھنٹے کے عمل سے دو گھنٹہ تک روبکار رہا اور بعد تحقیق و تجویز حسب ایکٹ مذکور ان اکتیس آدمیوں میں سے چودہ آدمیوں کو پھانسی کا حکم دیا گیا اور سولہ آدمیوں کو حکم قید میعاد دو سال اور ایک آدمی کی رہائی سزائی تازیانہ ہوئے...پیر علی نام ایک شخص تھا افسر بدمعاشان و ہنگامہ پردازان جس کے ہاتھ سے ڈاکٹر لیل صاحب مارے گئے۔ دوسرا گھسیٹا نام ایک شخص تھا، جمعدار سید لطف علی خاں جو اس شہر میں لکھپتے و ذی دول مشہور ہیں اور بالفعل کی سپاہی مفرور کے اپنے گھر میں محفوظ رکھنے کی علت میں حاجت تحریر میں ہیں۔ بالآخرہ ان دونوں نے بھی پھر کسیکا نام و نشان حسب خواہ ظاہر نہیں کیا اور پھر بھی تعمیل حکم مرکوز ہوئے۔"

(جلد-2 نمبر 21، 21 جولائی 1857، صفحہ 4)

"مقدمہ بغاوت سرکار میں میر وارث علی جمعدار کو پھانسی دی جانے کا حکم جو صاحب مجسٹریٹ بہادر نے از رو دعا اختیار مندرجہ ایکٹ لا 1857 صادر فرمایا تھا۔ اس کا ذکر پرچہ سابق میں کیا گیا ہی۔ اب اس قدر معلوم ہوا کہ حضرت پھانسی کے وقت تک برابر کلمہ پڑھتے رہے۔"

(جلد-2 شمارہ 21، 21 جولائی 1857، صفحہ-5)

"اخبار بہار" پٹنہ ڈویژن کے کمشنر ولیم ٹیلر کے 20 ستمبر 1857 کو تبادلہ کر دیے جانے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد بہار سے تقریباً دس سال تک کوئی اخبار شائع نہیں ہوا۔

اس اخبار کا ذکر "اختر شہنشاہی" میں نہیں ملتا۔ عتیق صدیقی کی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" میں صفحہ 457 پر "اخبار بہار" کا ذکر ہے لیکن اس کا مقام اشاعت کلکتہ لکھا گیا ہے اور سن اشاعت 1855 بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے انھیں سہو ہوا ہے۔

1853 سے 1856 کے درمیان بہار سے جو چار اخبارات منظر عام پر آئے، ان میں "پٹنہ ہرکارا" کی ایک فائل اپریل تا جون 1856 اور "اخبار بہار" کی ایک فائل ستمبر تا دسمبر 1856-1857 کے کچھ مختلف شمارے خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔

"اخبار بہار" کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کے حوالے سے عابد رضا بیدار لکھتے ہیں:

"اخبار بہار" پٹنہ ہرکارا کی طرح شاہ ابوتراب کے مطبع میں چھپتا تھا۔ شاہ ولایت علی اس کے مہتمم تھے۔ پٹنہ ہرکارا کا پہلا شمارہ جو 12 صفحات پر مشتمل ہے۔ 21 اپریل 1855 کو نکلا۔ قاضی عبدالودود کے بقول یہ 1856 کے اگست تک اسی نام سے نکلتا رہا اور یکم ستمبر 1856 کو اس کا نام "اخبار بہار" ہو گیا... پٹنہ ہرکارا 12 صفحوں کا ہوتا تھا اور اخبار بہار 8 صفحے کا۔ ہلال کی جو شکل پہلے صفحے پر ہوتی تھی۔ اس کے سادہ حصے میں ہرکارا لکھا جاتا تھا اور اندرونی ہلالی حصے میں پٹنہ ہرکارا 1271ھ اردو میں اور Patna Hurcara-1855 انگریزی حصے میں لکھا ہوتا تھا۔ اخبار بہار میں انگریزی حصہ ختم ہو گیا۔"

(سن ستاون سے پہلے کا ہندوستان، بہار کے اخبار بہار کی روشنی میں۔ صفحہ پیشگفتار)

"پٹنہ ہرکارا" کی طرح "اخبار بہار" کا شاہ ابوتراب کے مطبع میں شائع ہونا اور چند شماروں میں سرنامے کی مماثلت کی بنا پر "اخبار بہار" کو ہی "پٹنہ ہرکارا" کی دوسری شکل بتانا، درست نہیں۔ "اخبار بہار" نے اپنے ابتدائی شماروں میں "پٹنہ ہرکارا" کی نقل ضرور کی، لیکن بعد میں اس کا سرنامہ، تعداد صفحات اور انداز تحریر بھی بدل گیا۔ اس کے مدیر لالہ بندا پرشاد حسرتی اور مالک شاہ ولایت تھے۔

□□□

پتہ:
New Karimganj, Gaya-82300 (Bihar)

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہند و پاک میں "انتخاب کلام درد" اور "دیوان درد" کے انھی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے "دیوان درد" کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کر دی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: 160/- روپے

مظہر علی

آل انڈیا ریڈیو کی اردو خدمات

آل انڈیا ریڈیو کا قیام 8 جون 1936 کو عمل میں آیا۔ اس کے بعد جب دلی ریڈیو اسٹیشن میں ہندوستانی ٹاکس کا شعبہ قائم ہوا تو اس وقت احمد شاہ بخاری (پطرس بخاری) اسٹیشن ڈائرکٹر اور ذوالفقار علی بخاری پروگرام ڈائرکٹر تھے۔ یہ دور ریڈیو پر ادبی شخصیتوں کے لیے غلبے کا دور تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے بہترین ذہن آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ اس سلسلے میں ذوالفقار علی بخاری اپنی آپ بیتی ''سرگذشت'' میں لکھتے ہیں۔

''آغا اشرف کو ساتھ لے کر ہر ایک کے دردولت پر حاضری دی اور بصد التماس انھیں ریڈیو پر تقریر کرنے کے لیے رضا مند کیا۔ ڈاکٹر انصاری، خواجہ حسن نظامی، بھائی آصف علی، مرزا محمد سعید، نواب خواجہ عبد الحمید، ڈاکٹر ذاکر حسین، بیگم سربلند جنگ، آغا شاعر قزلباش، شمس العلما مولوی عبد الرحمٰن، منشی پریم چند، مرزا فرحت اللہ بیگ، پرنسپل رشید احمد صدیقی کس کس کے نام گناؤں یہ تھے ہمارے مستقل طور پر تقریریں نشر کرنے والے حضرات۔ لاہور میں ابھی ریڈیو جاری نہ ہوا تھا مگر سالک اور امتیاز علی تاج کے بغیر محفل سونی ہو جاتی۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا کہ یہ حضرات لاہور سے ٹیلی فون پر بولیں اور ہم دہلی سے ان کی تقریریں نشر کریں۔''

(بہ حوالہ ''اردو، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان''۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی۔ ص: 236)

لیکن 1946 میں عبوری حکومت کے قائم ہوتے ہی آل انڈیا ریڈیو سے اردو کو ختم کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں اور تقسیم ہند کے بعد اردو زبان دیگر سرکاری محکموں کی طرح ریڈیو اسٹیشن پر بھی یتیم سی ہو گئی۔ اس کے باوجود آل انڈیا ریڈیو کی اردو خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ہندوستان میں پہلی بار 1921 میں ریڈیو نشریات کا آغاز ایک موسیقی پروگرام سے ہوا۔ اردو زبان جو خود موسیقیت سے پُر ہے اور جس کے الفاظ نرم، شیریں اور لچکدار ہونے کے باعث نغمگی اور ترنم سے لبریز ہیں اس کے تلفظ اور ادائیگی میں معمولی سی لاپروائی یا غلطی بھی کانوں کو کافی گراں گزرتی ہے۔ ایسے میں موسیقی کے زیر و بم اور پیچ و خم کا ساتھ دینے میں یہ زبان سب سے زیادہ موزوں اور موثر ثابت ہوئی ہے۔ شاعری کی بھی اصناف بالخصوص گیت یا غزل کو اگر موسیقی کے ساتھ پیش کرنا ہو تو اس کام کو اردو داں سے زیادہ بہتر طریقے سے اور کوئی نہیں انجام دے سکتا۔ رفعت سروش اپنی کتاب ''براڈ کاسٹنگ'' میں لکھتے ہیں:

''34 میں آل انڈیا ریڈیو شروع کرنے والوں نے اس اہم مسئلے کی نزاکت کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ دیگر اسٹاف کے علاوہ میوزک سیکشن میں ایک ایسا شخص بھی ضرور ملازم رکھا جاتا تھا جس کو زبان و بیان پر اتنی قدرت ہو کہ موسیقی کے فن کاروں کا تلفظ براڈ کاسٹ سے پہلے درست کرا سکے اور نہ صرف تلفظ درست کرا سکے بلکہ اس کو شعر فہمی کے علاوہ یہ بھی سمجھ ہو کہ کون سا گیت یا کون سی غزل سُر تال کے اعتبار سے گانے کے لیے موزوں ہے اور جس کے مطالب بھی قابل تعریف ہوں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ابتدا سے ہی کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔''

(براڈ کاسٹنگ۔ رفعت سروش۔ ص 18 تا 19)

اُس زمانے میں ریڈیو نشریات کے سامعین تمام چھوٹے بڑے شہروں اور دور دراز کے گانوں میں رہتے تھے اور شوق سے ریڈیو سنتے تھے۔ اُن تک عمدہ اور معیاری غزلوں، گیتوں اور قوالیوں کے پروگرام پہنچانے میں آل انڈیا ریڈیو نے اہم رول انجام دیا۔ ان پروگراموں کی وجہ سے اردو زبان کی رسائی ملک کے گوشے گوشے تک ممکن ہو سکی۔

اب آل انڈیا ریڈیو کے قیام کو تقریباً 74 سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے کی کارگزاریوں کو قلمبند کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کیونکہ اس کی تاریخ سے متعلق تمام دستاویز دستیاب نہیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی بہت بکھری ہوئی ہیں۔ انھیں یکجا کرنا اور ترتیب دینا ایک مشکل اور دقت طلب کام ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''اردو میں جو پروگرام نشر ہوئے ہیں ان کا اشاریہ مرتب کرنا تو دور کی بات، ان پروگراموں کا اشاریہ بنانا بھی ممکن نہیں جن کے مسودے اسٹیشنوں کی اسکرپٹ لائبریریوں میں ہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں: 1. ان مسودوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ 2. مسودوں کو قرینے اور ترتیب سے نہیں رکھا گیا۔ اس لیے نہیں کہ ریڈیو کے افسروں کو ان مسودوں کی اہمیت کا احساس نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے کہ عملے کی بھی کمی تھی اور جگہ کی بھی... پھر بھی آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام جرنل ''آواز'' میں شائع ہونے والے اسکرپٹوں سے محدود پیمانے پر ایک فہرست تیار کی گئی ہے۔ صرف ''آواز'' کا اشاریہ تیار کرنا بھی ایک بڑا تحقیقی کام ہوگا۔''

(اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان۔ ص: 412 تا 413)

آل انڈیا ریڈیو نے ملک کے تقریباً ان تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو پروگرام نشر کرنے کا انتظام کیا جہاں اردو آبادی رہتی تھی۔ 1979 کے ایک سروے کے مطابق تقریباً 36 اسٹیشنوں سے اردو پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ ان میں دہلی، کلکتہ، احمد آباد، بھوپال، بنگلور، حیدرآباد، پٹنہ، رانچی، شملہ اور ناگپور جیسے کئی مراکز ہیں۔ ان تمام مراکز سے پانچ یا دس منٹ کی اردو خبریں بھی نشر ہوا کرتی تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے کچھ ایسے اسٹیشن بھی تھے جو علاقائی اردو نیوز بلیٹن نشر کیا کرتے تھے۔ ان میں سری نگر، لیہہ، جموں، پٹنہ، رامپور، وارانسی، لکھنؤ، حیدرآباد اور نگ آباد شامل ہیں۔

"اردو مجلس" کے نام سے ایک پروگرام کا آغاز 22 فروری 1960 کو دہلی سے ہوا تھا۔ لیکن اسے طاقتور ٹرانسمٹر سے ہٹا کر کمزور ٹرانسمٹر پر ڈال دیا گیا۔ اس کی ناکامی کے بعد 24 اکتوبر 1965 کو اکسٹرنل سروسیز سے روزانہ آدھے گھنٹے کی اردو سروس شروع کی گئی۔ بعد میں یہی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس بنی۔ شروع میں یہ سروس آدھے گھنٹے کی تھی اور پاکستان کے لیے شروع کی گئی تھی۔ یہ مئی 1966 میں 9 گھنٹے روزانہ کی سروس کردی گئی۔ اس پر خبروں کے علاوہ مختلف قسم کے سیاسی اور تہذیبی پروگرام نشر ہوتے تھے اس کے علاوہ فلمی گانوں کے پروگرام بھی پیش کیے جاتے تھے۔

آل انڈیا ریڈیو نے مختلف قسم کے ادبی پروگرام بھی کئی اسٹیشنوں سے نشر کیے مثلاً مشہور ادبی شخصیتوں سے بات چیت، کہانی، جھلکی، فکاہیہ کہانی اور ڈرامے وغیرہ۔ ان میں دہلی، لکھنؤ، گورکھپور، پٹنہ، جالندھر، ممبئی، اورنگ آباد، ناگپور، کلکتہ، رام پور، بنگلور اور سری نگر کے مراکز اہم ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو نے اردو شاعری کی مقبولیت بڑھانے میں بھی حصہ لیا اور مشہور شعرا کے کلام کو لوگوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کلام شاعر بزبان شاعر کے تحت کئی اردو شعرا کی آوازیں محفوظ کر کے آل انڈیا ریڈیو نے تاریخ کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔ اردو کی جو نایاب ریکارڈنگز آل انڈیا ریڈیو کے پاس موجود ہیں ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

(1) جگر مرادآبادی۔ یہ واحد ریکارڈنگ ہے جو ریڈیو کشمیر سری نگر نے 1955 میں کی تھی۔ اس کے علاوہ جگر کی کوئی اور گفتگو برصغیر میں یا کہیں اور نہیں ہے۔ پندرہ منٹ کی اس گفتگو میں انھوں نے اپنی شاعری کے ارتقا اور اپنے نظریات کو پیش کیا ہے اور وہ اشعار بھی سنائے جنھیں وہ اہم سمجھتے تھے۔ (2) فراق گورکھپوری: عمر رفتہ پر ایک نظر تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو ہے۔ (3) فیض اور سجاد ظہیر کی گفتگو (4) فیض۔ کلام شاعر (5) مجاز۔ مجاز کی ایک نظم اور غزل (6) مخدوم۔ دو نظموں کی ریکارڈنگ (7) کرشن چندر۔ پندرہ منٹ کی ایک گفتگو (8) راما نند ساگر سے ایک ملاقات (9) محی الدین قادری زور کی ایک غزل ان کی آواز میں (10) ہری چند اختر۔ کلام شاعر (11) خواجہ احمد عباس۔ ایک ملاقات (12) جذبی۔ کلام شاعر (13) امتیاز علی عرشی۔ یادداشتیں (14) ڈاکٹر ذاکر حسین۔ نہرو کی موت پر فی البدیہہ تقریر اور صدر ہونے کے بعد کی تقریر (15) فیض کے انتقال پر پروگرام۔ جس میں عصمت چغتائی، سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری نے خراج عقیدت پیش کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ متعدد موضوعات پر مختلف ادبی شخصیتوں کی تقریریں، مضامین، انشائیے، فیچر، خاکے اور ڈرامے بھی نشر ہوئے جو اردو زبان میں گراں قدر سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام خواجہ حسن نظامی کا ہے جن کے مضامین کا مجموعہ "سی پارۂ دل" خالص ریڈیو نشریات کا مجموعہ ہے۔

بیدی، منٹو، کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک نے بھی کئی چیزیں ریڈیو کے لیے لکھیں۔ افسانہ نگار منٹو کو ڈراما نگار اور فیچر نگار بنانے والا ریڈیو ہی تھا۔

راجندر سنگھ بیدی کے ریڈیو ڈرامے سات کھیل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان میں چانکیہ، تلچھٹ، نقل مکانی، آج، رخشندہ اور خواجہ سرا اہم ہیں۔ بیدی نے ریڈیو کے لیے نقل مکانی نہ لکھا ہوتا تو شاید ہندوستانی فلمی صنعت کو "دستک" جیسی فلم نصیب نہ ہوئی ہوتی۔

پریم چند کی کئی کہانیاں انھیں کی زبان میں معمولی سی تبدیلی کے بعد نشر ہوئیں اور مقبول بھی ہوئیں۔ شطرنج کے کھلاڑی ایک اچھی فلم بھی ثابت ہوئی اور کفن نہ صرف ریڈیو پر ڈرامے کی شکل میں نشر ہوئی بلکہ اس کی ٹیلی فلم بھی بنی۔

آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی کئی تقریریں، مزاحیہ مضامین اور ڈرامے مقبول عام ہو کر آج تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان میں سید انصار ناصری دہلوی کا ڈراما "شادی کی اونچ نیچ" اور "جوگی" امتیاز علی تاج کا ڈراما "انارکلی"، شوکت تھانوی کا مزاحیہ مضمون "سودیشی ریل"، حضرت آوارہ کا "کوا چلا ہنس کی چال"، اشرف صبوحی کا خاکہ "موٹے آکا"، فضل حق قریشی کا مزاحیہ مضمون "بھائی جان سے ریڈیو خریدا"، خواجہ احمد عباس کا مضمون "فلم میں بے ہودگیاں"، محمد حسن کے ڈرامے "تماشا اور تماشائی"، "پیسہ اور پرچھائیں" اور "مور پنکھی"، آل احمد سرور کا انشائیہ "یادش بخیر ہم بھی جوان تھے" اور شمیم حنفی اور رفعت سروش کے متعدد ڈرامے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو نے عوام میں کتابوں کو مقبولیت بخشنے میں یا ان کتابوں کے مواد کو عام لوگوں تک پہنچانے میں بہت مدد کی۔ ایسی کتابیں جو عوام تک نہیں پہنچی تھیں آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے آسانی سے ان تک پہنچ گئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اخلاق اثر لکھتے ہیں:

"جہاں تک کتابوں کے عام مطالعے کا تعلق ہے ریڈیو نے تھیٹر کے تماشائیوں کی طرح کتاب کے قارئین کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ ریڈیو پر

کتابوں کی سلسلہ وار پڑھائی ان کی تلخیص اور ریڈیو ڈرامہ روپ نے کتابوں کی فروخت میں اضافہ کیا اور عام سامعین کو عام مطالعے کے علاوہ ادب کے مطالعے کا شوق دلایا... ہندوستان میں دیگر زبانوں کے علاوہ اردو میں پریم چند، کرشن چندر، بیدی اور منٹو کی کہانیاں، اقبال، غالب، میر اور مومن کے علاوہ ساحر، مجروح، حسرت، کیفی، سردار جعفری اور نشور واحدی کے کلام نے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے قارئین کو اردو شعر وادب کی طرف متوجہ کیا''

(نشریات اور آل انڈیا ریڈیو، ڈاکٹر اخلاق اثر۔ ص:21 تا 23)

آل انڈیا ریڈیو کی وجہ سے اردو کی بہت سی مشہور کتابیں بھی معرض وجود میں آئیں۔ مثلاً رشید احمد صدیقی کی تصنیف ''خنداں'' ریڈیو پر نشر ہونے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آل احمد سرور کی کتاب ''تنقیدی اشارے'' بھی ریڈیو نشریات کا مجموعہ ہے جس میں تنقید کے لیے نہایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس طرح ریڈیو نے اردو نثر کا رخ سادگی کی طرف موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ ریڈیو کے لیے کامیاب تقریریں گفتگو کا تحریری روپ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید جیسی روکھی پھیکی صنف سے بھی عوام کو تھوڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔

ریڈیو نشریات کے زیر اثر اردو ادب میں بعض نئی اصناف کا اضافہ بھی ہوا مثلاً ریڈیائی ڈرامہ، ریڈیو اوپیرا، ریڈیائی تقریریں اور ریڈیو فیچر وغیرہ۔ ریڈیو کے اثرات اردو نثر و نظم کے اسالیب میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ نثر میں سادگی و سلاست ایجاز واختصار اور صراحت وقطعیت جیسی خوبیاں پیدا ہوئیں تو نظموں میں صوتی آہنگ کا نیا شعور بیدار ہوا۔ نثری اسلوب میں ڈرامے کو کافی فروغ حاصل ہوا جس کی روایت اردو ادب میں برائے نام تھی۔

آج بھی آل انڈیا ریڈیو کی مختلف یونٹیں ریڈیو پر مشاعروں، ادبی مذاکروں اور دیگر ادبی پروگراموں کا اہتمام کرتی ہیں جو اردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں بہت اہم ہیں۔ غزل کا جادو ریڈیو پر آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ آج ہر ریڈیو اسٹیشن اس صنف کا محتاج ہے مہدی حسن، غلام علی، بیگم اختر، جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس اور عابدہ پروین کی گائی ہوئی غزلیں مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے سامعین کو لطف اندوز کر رہی ہیں۔

حوالے:

(1) اردو، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی۔ 1998

(2) براڈ کاسٹنگ۔ رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر نوئیڈا۔ یوپی۔ 2000

(3) نشریات اور آل انڈیا ریڈیو۔ ڈاکٹر اخلاق اثر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔ 1982

□□□

پتہ:
Research Scholar,
Deptt. of Urdu, JMI, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی. گھا نے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عبدالباری

پنڈت جواہر لعل نہرو — نئے ہندوستان کے معمار

پنڈت جواہر لعل نہرو کا شمار دنیا کی عظیم شخصیتوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم تھے، وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت دانشور، مورخ، رہنمائے قوم، ادیب اور ایک کامیاب سیاست داں۔

پنڈت نہرو نے 4 نومبر 1889 کو الٰہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو کے گھر میں آنکھیں کھولیں۔ نہرو خاندان دولت وثروت اور علم وفضل میں مشہور تھا۔ پنڈت نہرو کا لڑکپن عیش وعشرت میں گزرا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین اور باصلاحیت تھے۔ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو نے اپنے اہل خاندان کے منع کرنے کے باوجود پنڈت نہرو کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ پنڈت نہرو نے ولایت میں سات سال گزارے۔ 1912 میں وہ بیرسٹر بن کر اپنے وطن لوٹ آئے اور اپنے والد کے پیشے وکالت سے منسلک ہوئے مگر پنڈت نہرو کی طبیعت وکالت کے پیشے کی طرف مائل نہیں تھی۔ انھیں عوامی مسائل اور سیاسی امور میں خاصی دلچسپی تھی چنانچہ وکالت کو خیرباد کہہ کر ''سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ اپنے والد پنڈت موتی لال نہرو کی طرح وہ بھی کانگریس کے سرگرم رکن بن کر سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ 40 سال کی عمر میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ایک سچے محب وطن تھے۔ انھوں نے ہندوستان کو برطانیہ کی غلامی سے آزاد کرانے کی کوششوں کے علاوہ ملک کے کمزور طبقات کے مسائل کو حل کرنے میں بھی ہمیشہ دلچسپی لی۔ ان کی فکر اور تڑپ نے انھیں ٹریڈ کانگریس کا صدر بنایا۔ مولانا محمد علی جوہر مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، سردار پٹیل، مولانا حسرت موہانی اور دیگر مجاہدین آزادی کے کارواں میں پنڈت نہرو بھی شامل ہوگئے۔ جب مہاتما گاندھی نے انگریزی سرکار کے خلاف ستیہ گرہ کا آغاز کیا تو پنڈت نہرو بھی اسے آگے بڑھانے والوں میں تھے۔ انھیں متعدد بار انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ قیدوبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ پنڈت نہرو کی انقلابی لگن کو دیکھتے ہوئے ملک راج آنند نے کہا:

''جواہر لعل نہرو نے جدوجہد کا مشکل راستہ چنا ہے۔ مراعات یافتہ طبقے کا ایک نوجوان آزادی کی تحریک میں کود پڑا ہے۔ اس طرح وہ ایک ایسا انسان بن گیا ہے جسے روزانہ صرف اپنے ہم سطح بلکہ ہر سطح کے ان لوگوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جو استحصال اور بربریت کے نظام تلے دبے ہوئے چلے آرہے ہیں۔''

ملک کی آزادی کے بعد پہلے وزیراعظم کی حیثیت سے پنڈت نہرو نے ملک کی تعمیر نو کا سنگ بنیاد رکھا اور ان خوابوں کو تعبیر دینے کی انتھک کوشش کی جو یہاں کے عوام برسوں سے دیکھتے آرہے تھے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ قیدوبند میں گزرا لیکن ایام اسیری میں وہ خاموش نہیں بیٹھے اور اپنے قلم سے کام لیتے رہے۔ ملک کے سماجی اور سیاسی حالات پر لکھنے کے علاوہ وہ اپنے نام آنے والے مکتوبات کا جواب دیتے۔ ان کی کچھ کتابیں بھی ان کے ایام اسیری کی دین ہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کی تعلیم چونکہ انگلستان میں ہوئی تھی لہٰذا انگریزی زبان وادب میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی سبھی تحریریں انگریزی میں ہیں۔ جن اہل قلم سے ان کی ذہنی قربت تھی ان میں فرانسیسی ادیب رومان اولاں، انگریزی ادیب جارج برنارڈ شا کے علاوہ ان کے ہم وطن رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر علامہ اقبال شامل تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں بھی شرکت کی تھی اور خطبہ پڑھا تھا۔

پنڈت نہرو ایک مورخ کی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔ ان کی کتاب "The Quest of India" جو اردو میں ''تلاش ہند'' کے نام سے چھپی ہے۔ ان کے تاریخی شعور کا دستاویزی ثبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں مورخ نہیں ہوں۔ تاریخ کے موضوع پر میری تحریریں تاریخی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن میں اپنی تحریروں کے ذریعے شعور کو بیدار کرنا چاہتا ہوں جو آج کے زندہ ذہن کے لیے ضروری ہے۔''

پنڈت جواہر لعل نہرو کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھیں مناظر فطرت اور دلکش نظاروں سے والہانہ محبت تھی۔ پھول، پودوں، عمارتوں اور مختلف فنون کے شہپاروں کے علاوہ انھیں قوم کے نونہالوں سے بے حد لگاؤ تھا اسی لیے بچے انھیں چاچا نہرو کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے یوم پیدائش کو یوم اطفال کے طور پر منایا جاتا ہے۔

پنڈت نہرو شیروانی زیب تن کرکے اور اس پر سرخ گلاب لگا کر ہندوستانی تہذیب کی زندہ تصویر نظر آتے تھے۔ 27 مئی 1964 کو پنڈت جی وفات پاگئے۔ جب ان پر بیماری کا حملہ ہوا تو وہ پارلیمنٹ کے ایک سیشن میں تھے۔ چند گھنٹے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی تاریخ کا ایک روشن باب بند ہوگیا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پتہ:
Deptt. of Urdu, Arabic, Farsi, Puna College of Arts, Science & Commerce, Camp, Pune-1, (Maharashtra)

وہاب قیصر

مولانا آزاد اور اردو یونیورسٹی

اردو یونیورسٹی ملک کے اردو بولنے والوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے جو حکومت سے مسلسل نمائندگی کی بدولت 9 جنوری 1998 کو حیدرآباد میں قائم کی گئی۔ اس مرکزی اور قومی یونیورسٹی کو مولانا آزاد کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح پچاس سال قبل جہاں اردو ذریعۂ تعلیم کی جامعہ عثمانیہ کو انگریزی ذریعۂ تعلیم کی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا تھا اسی شہر میں اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو قائم ہوئے قریب گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ جب ہم اس یونیورسٹی کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یونیورسٹی میں اور مولانا آزاد کے نظریات، تصورات اور خواہشات میں بڑی مطابقت نظر آتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حکومت اور یونیورسٹی کے اقتدار اعلیٰ نے پہلے مولانا آزاد کی زندگی کا بہ غائر مطالعہ کیا ہو اور پھر تعلیم کے تئیں ان کے جو تصورات تھے ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ہو۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ مولانا آزاد کے نام کی برکت سے اس یونیورسٹی نے مختلف سمتوں میں جو پیش رفت کی ہے وہ ان کے خیالات کی عملی تشکیل کا باعث بنی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر، ادیب، انشا پرداز، خطیب، صحافی، عالم، مفکر، مفسر قرآن، مجاہد آزادی، مصلح قوم، ہندو مسلم اتحاد کے داعی، ماہر تعلیم۔ ستمبر 1946 میں جب عبوری حکومت قائم ہوئی تو مولانا اس میں شریک نہیں تھے۔ پنڈت نہرو کے اصرار پر اور مہاتما گاندھی کے مشورے پر جنوری 1947 میں بحیثیت وزیر تعلیم حکومت میں شامل ہوئے۔ آزادی کے بعد سائنس اور کلچر کی ذمے داری بھی انھیں سونپی گئی۔ 1952 کے پہلے عام انتخابات کے بعد سائنسی تحقیقات بھی ان کے سپرد کر دی گئیں۔ ملک کی تعلیمی ترقی اور استحکام میں ان کی بیش بہا خدمات رہی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بقا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترقی، سکنڈری ایجوکیشن کمیشن، یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی کھڑک پور کا قیام ان کی قابل ذکر تعلیمی خدمات ہیں۔ جنوری 1947 سے فروری 1958 تک گیارہ سالہ دور وزارت میں انھوں نے ملک میں پہلے سے قائم درس گاہوں کی تعداد کو دوگنا کر دیا تھا اور تعلیمی بجٹ کو 2 کروڑ سے بڑھا کر 30 کروڑ کر دیا تھا۔

مولانا آزاد نے جب 1906 میں ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کیا تھا تو اس کے اہم مقاصد میں اردو زبان کی ترقی اور اس کا تحفظ تھا۔ اس سلسلے میں ایک بار انھوں نے لکھا تھا کہ ''کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس میں جدید اور تکنیکی علوم پر لکھی گئی کتابیں شائع نہ کروائی جائیں۔''

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایکٹ میں جو اہم مقاصد بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے پہلا مقصد اردو کا فروغ ہے۔ اردو کے فروغ میں اردو میڈیم سے اعلیٰ تعلیم کی فراہمی اور اس کے لیے اردو کی کتابوں کی اشاعت بھی پیش نظر رہی ہے۔ مولانا آزاد نے عبوری حکومت کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے 18 فروری 1947 کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''میٹرک تک مادری زبان میں ذریعۂ تعلیم کامیاب رہا ہے اور اب وقت آ چکا ہے کہ نہ صرف اس کو اپنائیں بلکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی مقامی زبان کا انتخاب کریں۔''

مولانا آزاد مغربی تعلیم اور مادری زبان سے متعلق اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں:

''سب سے پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہندوستان میں مغربی تعلیم جو شروع کی جائے تو اس کی رونمائی مادری زبان میں ہو۔ اس علم کا گھونگھٹ جو کھلے اور ہٹے تو مادری زبان میں تاکہ جب چہرے کی نقاب اتاری جائے اور علم کا روئے زیبا سامنے آئے تو طالب علم کا دل بول اٹھے کہ یہ تو جانی پہچانی صورت ہے۔'' (خطبات آزاد)

مولانا آزاد کے اس بیان کے لحاظ سے دیکھیں تو اردو یونیورسٹی کے قیام ہی میں اس کی تکمیل نظر آتی ہے۔ جہاں اعلیٰ تعلیم انگریزی کی بجائے مادری زبان، اردو میں دی جانے کی کامیاب سعی کی جارہی ہے۔ آج اس یونیورسٹی میں بی۔ اے، بی ایس سی اور بی کام کے علاوہ ایم بی اے، ایم اے ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم، ایم۔ اے پبلک ایڈمنسٹریشن، بیچلر آف ایجوکیشن، ماسٹر آف ایجوکیشن اور پی جی ڈپلوما ان انفارمیشن ٹکنالوجی کے علاوہ کئی ایک کورس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی تعلیم اردو میڈیم میں دی جارہی ہے۔

مولانا آزاد تعلیم نسواں سے متعلق 31 مئی 1948 کو ایک پریس کانفرنس میں اپنے خطاب میں فرماتے ہیں: ''اس کی بدولت ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ تعلیم یافتہ مائیں بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں معاون ثابت ہوں گی۔''

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایکٹ کے اہم مقاصد میں ایک مقصد تعلیم نسواں پر توجہ مرکوز کرنا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کے تحت سارے ملک میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں 50 فیصد خواتین ہیں۔ روایتی تعلیمی نظام کے

تحت یونیورسٹی کے کیمپس میں شعبہ تعلیم نسواں قائم ہے جس کے تحت ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ ڈی کی تعلیم دی جارہی ہے۔ خواتین کے تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور معاشی مسائل کے مطالعے کے لیے یونیورسٹی میں Centre for Women Studies قائم کیا گیا ہے جو دیہی، مضافاتی اور شہری خواتین پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے سنٹر کے اغراض کی تکمیل کررہا ہے۔

مولانا آزاد نے بحیثیت وزیر تعلیم حکومت ہند، بالغوں کی تعلیم میں وسعت پیدا کی تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد میں روایتی تعلیم کے علاوہ فاصلاتی نظام تعلیم بھی شامل ہے جس کے ذریعہ وہ خواتین وحضرات جو اپنی تعلیمی زندگی میں اعلیٰ تعلیم کے حصول سے محروم رہے، وہ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے 21 دسمبر 1947 کو پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے خطاب میں کہا تھا:

''اعلیٰ تعلیم میں انگریزی کو یکسر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ یوروپ اور امریکہ سے ربط ضبط کے لیے، ان کے علوم سے استفادے کے لیے اور ان کی ترقی سے فائدہ اٹھانے کے لیے اعلیٰ تعلیم میں انگریزی کو ایک خاص مقام دینا ہوگا۔''

اردو یونیورسٹی اپنے فاصلاتی اور روایتی دونوں ہی نظام تعلیم میں ایم۔ اے انگریزی کی تعلیم کا انتظام کررہی ہے۔ علاوہ اس کے کیمپس میں دی جانے والی ایم۔ اے اور ایم۔ بی۔ اے کی تعلیم میں انگریزی کا ایک پرچہ شامل نصاب ہے۔

مولانا آزاد ترجمے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ بلکہ ان کا ماننا تھا کہ کوئی زبان اسی وقت ترقی یافتہ کہلائی جاسکتی ہے جب کہ اس میں دوسری زبانوں کے علوم زیادہ سے زیادہ ترجمے کی شکل میں پائے جائیں۔ خود اردو زبان کے بارے میں بھی ان کا خیال یہی تھا کہ یہ زبان اسی وقت ترقی یافتہ کہلائی جاسکتی ہے جب کہ اس میں یوروپی جدید علوم کے تراجم کیے جائیں۔ چنانچہ 14 سال کی عمر میں 11 جون 1902 کو حکیم محمد علی طبیب ایڈیٹر ماہنامہ ''مرقع عالم'' کو لکھے گئے اپنے ایک مکتوب میں مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''حالتِ موجودہ کے لحاظ سے اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علوم مغربی کا ترجمہ کیا جائے۔'' (خطوط ابوالکلام آزاد، صفحہ 22)

وقت کی ضرورت کے تحت اردو یونیورسٹی نے ترجمے کی اہمیت کو محسوس کیا اور کیمپس میں شعبۂ ترجمہ قائم کیا۔ اس شعبے میں ایم۔ اے ترجمہ کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ اردو زبان میں قابل اور باصلاحیت مترجم پیدا کیے جاسکیں۔

مولانا آزاد نے اپنے دور وزارت میں تکنیکی تعلیم کو بڑی اہمیت دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کی تشکیل نو کی اور ملک میں تکنیکی تعلیم کو فروغ دیا۔ پہلے ہی سے ملک میں قائم غیر فعال ادارے کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کو نہ صرف وسعت دی بلکہ بہت حد تک فعال بھی بنایا۔ ان کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ فنی تعلیم کے بغیر ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مولانا آزاد 18 اگست 1951 کو اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں:

''وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔''

جہاں تک فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا تعلق ہے اس بارے میں اردو یونیورسٹی کے ایکٹ میں صاف طور پر یہ واضح کیا گیا ہے:

''اردو زبان میں تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی۔''

اس مقصد کی تکمیل کے لیے اردو یونیورسٹی نے حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں عصری لیباریٹریز اور ورکشاپس سے لیس ITIs یعنی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس قائم کر رکھے ہیں۔ حیدرآباد میں الکٹریشین، پلمبنگ، ریفریجریشن اینڈ ایرکنڈیشننگ، الکٹرانک میکانک اور ڈرافٹس مین (سیول) کے ٹریڈس، بنگلور میں ریفریجریشن اینڈ ایرکنڈیشننگ اور الکٹرانک میکانک ٹریڈس اور دربھنگہ میں الکٹریشن اور پلمبنگ کے ٹریڈس کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔ پورے ٹریڈس کے دوران طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ یہ ٹریڈس نیشنل کونسل آف ووکیشنل کورسس آف انڈیا اور یو جی سی کے تسلیم شدہ ہیں۔ اردو یونیورسٹی حیدرآباد کیمپس میں جو ورکشاپ قائم کیا گیا ہے وہ معیار کے اعتبار سے آندھراپردیش میں اول مقام رکھتا ہے۔

انجینئرنگ کے شعبوں میں ملک کو درکار ماہرین کی مانگ اور اس میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر یونیورسٹی 2008 سے ملک کے دو مقامات حیدرآباد اور بنگلور میں پالی ٹکنیک کالجس کا قیام عمل میں لارہی ہے۔ اس تین سالہ کورس میں صرف میٹرک کامیاب طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ حیدرآباد میں چار کورسس سیول انجینئرنگ، کمپیوٹر انجینئرنگ، الکٹرانکس اینڈ کمیونی کیشن انجینئرنگ اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی تعلیم کا انتظام رہے گا۔ جب کہ بنگلور میں تین کورسس سیول انجینئرنگ، کمپیوٹر انجینئرنگ اور الکٹرانکس اینڈ کمیونی کیشن انجینئرنگ کی تعلیم دی جائے گی۔

اردو یونیورسٹی کیمپس میں کمپیوٹر سائنس ڈپارٹمنٹ کے تحت انفارمیشن ٹکنالوجی میں پی جی ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ہیومانٹیز کے طلبہ کو بھی عصری ٹکنالوجی سے لیس کرنے کے لیے ایم۔ اے کے تمام کورسوں میں کمپیوٹر کا ایک پرچہ لازمی طور پر رکھا گیا ہے۔ ایم بی اے کورس میں کمپیوٹر کے پرچے کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا پرچہ بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ ایم۔ اے ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم میں میڈیا کے لیے درکار نت نئی ٹکنالوجیوں کا مفصل تعارف شامل نصاب کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد نے 7 فروری 1954 کو مرکزی مشاورتی مجلس تعلیم کے اپنے

ایک خطاب میں کہا تھا:

''جب تک اسکولوں کو ترقی نہیں دی جائے گی تب تک یونیورسٹی کی تعلیم اطمینان بخش نہیں ہوسکتی۔''

اردو یونیورسٹی نے اسکولوں کی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔ اردو میڈیم اسکولوں کو تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کے لیے یہاں ڈپلوما ان ایجوکیشن' بیچلر آف ایجوکیشن اور ماسٹر آف ایجوکیشن کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھانے والے غیر تربیت یافتہ اساتذہ کو فاصلاتی تعلیمی نظام کے تحت ان کی تربیت کے لیے ملک کے دس مقامات پر بی۔ایڈ کورس کا انتظام کیا گیا ہے۔ اردو میڈیم کے اساتذہ اور صدر مدرسین کی تعلیمی اور تنظیمی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے اردو یونیورسٹی میں مرکز برائے پیشہ ورانہ فروغ اساتذۂ اردو ذریعہ تعلیم (Centre for Professional Development of Urdu Medium Teachers) کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کا دائرۂ کار مہاراشٹر کے علاوہ پورا جنوبی ہندوستان ہے اور یہ سنٹر بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف ہے۔

اردو کے معیاری اسکولوں کی کمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو یونیورسٹی نے حیدرآباد اور دربھنگہ کے مقام پر CBSE انگریزی میڈیم اسکولوں کی طرز پر ایک ایک ماڈل اسکول قائم کیا ہے۔ ان ماڈل اسکولوں کو ملک کے اردو میڈیم کے پہلے اسکول ہونے کا اعزاز حاصل ہے جہاں پر CBSE کے نصاب کی تعلیم دی جارہی ہے۔

اردو ذریعۂ تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اردو یونیورسٹی میں انسٹرکشنل میڈیا سنٹر قائم کیا گیا ہے جس کے اسٹوڈیو میں ویڈیو اسباق تیار کیے جارہے ہیں۔ ریکارڈ شدہ ویڈیو اسباق' فاصلاتی نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں طلبہ کو دور درشن کے اردو چینل کے ذریعے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اردو یونیورسٹی نے دور درشن کیندر سے ایک معاہدہ کیا ہے اور یہ پروگرام 9 جنوری 2008 سے ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ وقتی طور پر ہفتے میں دو دن صبح 8 سے 9 بجے اور شام 5 سے 6 بجے دور درشن کا اردو چینل اردو یونیورسٹی کے اسباق کے علاوہ اردو شعر و ادب کی شخصیتوں پر اور اردو تہذیب کے گہواروں پر ریکارڈ شدہ ڈاکیومنٹری پروگرام نشر کررہا ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نظامت فاصلاتی تعلیم نے ملک میں اسی سال 2008 میں ابتدائی مرحلے کے طور پر پچاس اسٹڈی سنٹروں کو ٹی۔وی سیٹ کے ساتھ DVD پلیئر بھی فراہم کیا ہے تاکہ یہاں پر تیار کردہ ویڈیو اسباق کے CD انھیں بھیجے جانے پر طلبہ کو ٹی وی پر یہ پروگرام دکھلائے جاسکیں۔

مولانا آزاد نے اردو والوں میں قرآن فہمی کی شدت سے ضرورت محسوس کرتے ہوئے قرآنی متن کا ترجمہ کیا تھا اور ان کی تفسیر کی تھی جو ترجمان القرآن کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔ اردو یونیورسٹی نے نہ صرف کیمپس میں عربی زبان میں ایم۔اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کیا ہے بلکہ فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔اے میں اسلامیات (Islamic Studies) کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔ ملک میں ہزاروں طلبہ اس مضمون کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

مولانا آزاد کی صحافت نے تو شہرت کی بلندی کو چھولیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی صحافت انھی سے شروع ہوئی تھی جو انھی پر ختم بھی ہوگئی۔ ان کی ادارت میں نکلنے والے ہفتہ وار اخباروں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے تو اپنے دور میں دھوم مچا دی تھی۔ ان دو اخبارات کے علاوہ مولانا آزاد کئی دیگر اخبارات اور رسائل سے بھی وابستہ رہے۔

ملک کے اردو اخبارات اور الکٹرانک میڈیا جیسے ریڈیو اور ٹی وی چینلس کو تربیت یافتہ صحافیوں کی فراہمی کے لیے اردو یونیورسٹی نے کیمپس میں ایم۔اے' ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم اور فاصلاتی تعلیم میں ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن کورس شروع کیے ہیں جن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبا و طالبات اردو اخبارات اور ٹی وی چینلس پر روزگار حاصل کررہے ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنے دور وزارت میں ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی قائم کی تھی۔ ساہتیہ اکادمی، علاقائی زبانوں کے ہندوستانی ادیبوں کی تخلیقات شائع کرتی ہے اور ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایوارڈس سے سرفراز کرتی ہے۔ سنگیت ناٹک اکادمی، موسیقی اور ڈرامے کے فن کو فروغ دے رہی ہے۔ جب کہ للت کلا اکادمی، مصوری اور مجسمہ سازی جیسے فنون کی ترقی میں کوشاں رہتی ہے۔

اردو یونیورسٹی میں تہذیبی امور کے فروغ کے لیے ایک مرکز قائم ہے جس کو ''مرکز برائے اردو زبان' ادب اور تہذیب'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے اور اردو تہذیب کے تحفظ کے لیے لائحہ عمل تیار کرے۔ اردو کے نادر مخطوطات اور تحریروں کو حاصل کرکے محفوظ کرے۔ ملک میں موجود اردو کی نایاب کتابوں کو مختلف ذرائع سے حاصل کرے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں سے متعلق نایاب اور نادر اشیا کو حاصل کرے اور انھیں محفوظ کرے۔

غرض مولانا آزاد کی فکر و عمل اور اردو یونیورسٹی کی کارکردگی میں مطابقت اور یکسانیت کا پایا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ یونیورسٹی کا قیام' مولانا آزاد کی خواہشات کی بالواسطہ تکمیل کا باعث ہوا ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, MANUU,
Gachchi Bawli, Hyderabad

نعیم احمد

ہندوستان میں جنگلات کی اہمیت

کرۂ ارض پر انسان کو دیگر مخلوقات پر برتری حاصل ہے، اس لیے اس کے اچھے برے کی ذمے داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے۔ یہ زمین انسانوں کا مسکن ہے اور کوئی بھی اپنے مسکن کو تباہ و برباد نہیں دیکھنا چاہتا اور اسے بناتا، سنوارتا اور ہر طرح سے عزیز رکھتا ہے کیوں کہ اسے نقصان پہنچانے کا مطلب ہے اپنے لیے مشکلات کا سامنا پیدا کرنا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان زندہ رہنے کے لیے زمین پر پائے جانے والے حیوانات و نباتات پر انحصار کرتا ہے اور طرح طرح سے انھیں اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ یہ قدرت کا تقاضا بھی ہے لیکن جب ان کا استعمال کاروباری یا آرام و آسائش کی شکل اختیار کر جائے تو ماحولیات میں عدم توازن پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہی حال آج جنگلات کا ہے جنھیں کاروباری مقاصد کے لیے تباہ کیا جا رہا ہے اور ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی مارنے کے لیے بڑے پیمانے پر درختوں کی کٹائی جاری ہے لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اب جنگلات کے تحفظ کے لیے ہمارے ملک سمیت پوری دنیا میں اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

اس کے وافر ثبوت موجود ہیں کہ پورے ہندوستان میں کبھی گھنے جنگلات ہوا کرتے تھے۔ تہذیبوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ جنگلات کی ہیئت میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان ترقی کرتا گیا اور نتیجے کے طور پر جنگلات سمٹتے چلے گئے۔ جنگلات کی تباہی کے لیے بڑھتی ہوئی آبادی اور ان پر انسانوں کا انحصار خاص طور سے ذمے دار ہے۔

1990 کی دہائی کے اوائل میں تقریباً پانچ کروڑ ہیکٹیر یا ہندوستان کے بری علاقے کا 17 فی صد حصہ جنگلاتی تصور کیا جاتا تھا تاہم اس سے قبل 1987 میں جنگلات 6 کروڑ 40 لاکھ ہیکٹیر علاقے کا احاطہ کرتے تھے لیکن اس زمین کا 50 فی صد سے زائد حصہ یا تو بنجر تھا یا اس میں محض جھاڑیاں تھیں، اس لیے اصل جنگلاتی علاقہ ملک کے بری علاقے کا 3 کروڑ 50 لاکھ ہیکٹیر یا تقریباً دس فی صد تھا۔ 1980 کی دہائی کے دوران بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے جنگلاتی وسائل کی مانگ میں اضافہ سے جنگلوں کی صفائی اور ان کی تباہی کا سلسلہ جاری رہا، جس کی وجہ سے وہاں کی مٹی پر اس کا منفی اثر پڑا اور ایک اندازے کے مطابق چھ ارب ٹن زرخیز مٹی بہہ گئی لیکن پھر بھی ہندوستان میں جنگلات کی صفائی دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کی بہ نسبت بہت کم رہی۔

ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر جنگلات کی صفائی ہوئی، جس کے سبب یہ ممالک صنعتی اعتبار سے دیگر ترقی پذیر ممالک سے آگے نکل گئے لیکن اس سے ماحولیاتی نظام میں جو عدم توازن پیدا ہوا ہے، اس کا خمیازہ نہ صرف خود وہ ممالک بھگت رہے ہیں، بلکہ اس کی زد میں پوری دنیا ہے۔ خشک سالی، بے موسم بارش، سیلاب اور برف باری اس کی مثالیں ہیں۔ اب ان ممالک کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے لیکن گذشتہ کئی دہائیوں میں انھوں نے درختوں کی کٹائی سے جو تباہیاں مچائی ہیں، اس کا ازالہ چند برسوں میں ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ترقی پذیر ممالک پر زور دے رہے ہیں کہ وہ اپنے جنگلات کا تحفظ کریں تاکہ دنیا میں ماحولیاتی توازن برقرار رہ سکے۔

ملک کی آزادی کے بعد سے ہی جنگلات کا تحفظ ہند کی پالیسی رہی ہے۔ شجرکاری جو کہ پہلے پنج سالہ منصوبے کے دوران نہ کے برابر تھی۔ ساتویں پنج سالہ منصوبے کے دوران 8 کروڑ 90 لاکھ ہیکٹیر تک پہنچ گئی۔ 1951 سے 1991 کے عرصے کے دوران شجرکاری کا مجموعی علاقہ 17 کروڑ 90 لاکھ ہیکٹیر ہو گیا۔ تاہم بڑے پیمانے پر شجرکاری کے منصوبوں کے باوجود ہندوستان جنگل بانی کے میدان میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ جتنے درخت لگائے جا رہے ہیں، اس کا چار گنا کاٹے جا رہے ہیں۔ جنگلات میں مسلسل کمی کی وجہ سے کھیتی کے لیے زمین کی صفائی، پن بجلی کے پروجیکٹ، نئے شہری علاقوں کی تعمیر، صنعتی کارخانے، سڑکوں اور اسکولوں کی تعمیر ہے۔

مجموعی طور پر جنگلاتی زمین کا 20 فی صد حصہ مدھیہ پردیش میں ہے۔ دیگر ریاستیں جہاں جنگلات زیادہ پائے جاتے ہیں، ان میں اڑیسہ، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش (ہر ریاست میں ملک کے مجموعی جنگلات کا 9 فی صد)، اروناچل پردیش (7 فی صد) اور اتر پردیش (6 فی صد) شامل ہیں۔

جنگل بانی کے فروغ کے لیے ہندوستان کی طویل مدتی حکمت عملی سے تین اہم مقاصد کی عکاسی ہوتی ہے۔ زرخیز مٹی کے کٹاؤ اور سیلاب کو کم کرنا، لکڑی کی مصنوعات کے لیے گھریلو صنعتوں کو لکڑی سپلائی کرنا اور دیہی آبادی کی ضروریات کے لیے ایندھن کی لکڑی، چارے اور چھوٹی لکڑیاں فراہم کرنا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے زراعت سے متعلق قومی کمیشن نے 1976 میں ریاستی جنگل بانی کے محکموں کی تنظیم نو کی سفارش کی تھی اور سماجی جنگل بانی کے تصور کی

حمایت کی تھی، جس میں روایتی جنگل بانی اور جنگلات سے متعلق دیگر سرگرمیوں پر زور دیا گیا تھا۔

قومی معیشت اور ماحولیاتی کے توازن میں ہندوستان جنگلات کے رول پر 1988 کی قومی جنگلات پالیسی میں مزید زور دیا گیا ہے، جس میں ماحولیاتی استحکام کو یقینی بنانے، ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے اور بچے ہوئے جنگلوں کو تحفظ فراہم کرنے پر توجہ دی گئی۔ اس پالیسی کے دیگر مقاصد میں دیہی اور قبائلی عوام کی ایندھن کی لکڑی، چارے اور چھوٹی لکڑیوں کی ضرورت پوری کرنا اور جنگلاتی وسائل کے مینجمنٹ میں مقامی عوام کی شمولیت کی ضرورت کو تسلیم کرنا تھا۔ 1988 میں ہی جنگلات کے تحفظ سے متعلق قانون 1988 میں تبدیلی کی گئی تاکہ جنگلات کے تحفظ کے لیے سخت اقدامات کیے جاسکیں۔

1970 کی دہائی میں لوگوں کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ جنگلات کے ختم ہونے سے نہ صرف ماحولیات کو خطرہ لاحق ہوجائے گا بلکہ روزی روٹی کے لیے بھی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے، اس لیے انھوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی اور جنگلوں کے تحفظ کے پروگراموں میں شامل ہوگئے۔ اس سلسلے میں ہندوستان میں سب سے مقبول تحریک "چپکو تحریک" تھی، جس میں عورتوں نے درختوں کو بچانے کے لیے مفاد پرست عناصر سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اترپردیش کے ضلع چمولی کی عورتوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر کھیلوں کا سازوسامان تیار کرنے والی کمپنی ان کے ضلع میں دیودار کے درختوں کو کاٹنے کی کوشش کرے گی تو وہ درختوں سے لپٹ جائیں گی۔ 1973 میں اپنے آغاز کے بعد سے یہ تحریک پھیلتی ہی گئی اور ایک ماحولیاتی تحریک بن گئی۔ اس تحریک نے جنگلات کی صفائی کے عمل کو سست کردیا، ماحولیات کے تئیں بیداری پیدا کی اور عوامی طاقت کی اہمیت کا مظاہرہ بھی کیا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جنگلات ہندوستان کی دیہی معیشت کے لیے بہت اہم ہیں۔ زراعت کے بعد ہندوستان میں جنگلات میں سب سے زیادہ زمین کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ ملک و عوام کے لیے اہم قدرتی وسیلہ ہیں۔ ہندوستان کے ایک چوتھائی عوام جنگلات سے ہی تھوڑی بہت روزی روٹی کماتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کے تقریباً نصف فی صد جنگلات کو کافی نقصان پہنچا ہے اور ان کی اوسط پیداوار (Productivity) ایک تہائی رہ گئی ہے۔

عالمی بنک کے ایک تازہ سروے میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ جنگلات کے مینجمنٹ میں مقامی لوگوں کی شمولیت اور اس کے ساتھ ساتھ بہتر پیداوار ہندوستانی جنگلات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے میں مددگار ہوسکتی ہے اور گاؤوں کی غریبی بہت حد تک کم کرسکتی ہے۔ اس سے ملک کے قیمتی جنگلاتی وسائل کے تحفظ میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ان اقدامات کے نفاذ کے لیے ملکی اور ریاستی سطح پر اصلاحات کی جائیں تو دیہاتوں میں جنگلات سے ہونے والی آمدنی 2004 کے 22 کروڑ بیس لاکھ امریکی ڈالر کے مقابلے 2020 میں دو ارب امریکی ڈالر تک پہنچ سکتی ہے۔ تاہم ان اصلاحات کے نفاذ کے لیے مضبوط سیاسی قوت ارادی، وقت، صبروتحمل اور خطیر رقم درکار ہوگی۔ (بشکریہ "یوجنا" اردو، نئی دہلی)

□□□

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

شمیم احمد صدیقی

ایڈز ــــ ایک مہلک عارضہ

گذشتہ صدی کی سائنسی ترقیات نے بلاشبہ انسان کو راحت و آرام، آمدورفت اور پیغام رسانی وغیرہ کے حیرت انگیز سامان مہیا کیے ہیں، ساتھ ہی مادہ پرستی اور عیش کوشی کے جذبات کو بھی فروغ دیا ہے۔ اسی وجہ سے مختصر ترین مدت میں دنیاوی ترقی کے حصول کے لیے ہر ممکن طریقے سے کاروبار کو فروغ دینے کی فکر نے بیسویں صدی میں ایسے گھناؤنے طریقوں کو جنم دیا جو پہلے سوچے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ مثلاً فیشن کے نام پر ایسے ملبوسات کو فروغ دیا گیا جو صنف نازک کو زیادہ سے زیادہ عریاں کرکے دکھا سکیں۔ زیبائش کی مصنوعات کا بازار گرم کرنے کے لیے حسینۂ ملک، حسینۂ عالم اور حسینۂ کائنات جیسے ناموں سے ایسے فیشن شو ترتیب دیے گئے جن میں دوشیزاؤں کو برائے نام ملبوسات میں دنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ کاروباری طبقے کی دل بستگی اور جنسی تسکین کے لیے نت نئے طریقے بروئے کار لائے گئے۔ ٹی وی کے فحش اشتہارات، وی سی آر اور آمدورفت کی تیز رفتاری نے بہت سی برائیوں اور بیماریوں کو تھوڑے ہی عرصے میں جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ایڈز بھی موجودہ دور کی ایک ایسی بلا ہے جو تعلیم یافتہ اور مہذب سمجھی جانے والی مادہ پرست اور فیشن اور جدیدیت کے نام پر جنسی بے راہ روی کو اپنانے والی اقوام کے ذریعے اس تیزی سے پھیلی کہ ماہرین طب و عمرانیات اس کی ہولناکی سے بری طرح بدحواس ہیں۔

ایڈز (AIDS) ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہونے والا ایک ناقابل علاج مہلک عارضہ ہے جو 1980 کے بعد دریافت ہوا لیکن اس قدر تیزی سے پھیلا کہ اب تک دو کروڑ افراد اس کی گرفت میں آکر دردناک موت کا شکار بن چکے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق ایڈز کے اس پھیلاؤ میں زیادہ تر (تقریباً 85 فی صد) جنسی بے راہ روی، حرام کاری اور لواطت جیسی قبیح حرکتوں کا دخل ہے۔

ایڈز [AIDS] انگریزی زبان کے چار مخففات کا مرکب ہے یعنی [1] Aquired [2] Immuno [3] Deficiency [4] Syndrome

اس اجمال کی تفصیل درج ذیل ہے:

A - Aquired اکوائرڈ [اکتسابی]

I - Immuno امیونو [تحفظی]

D - Deficiency ڈیفی شینسی [قلت]

S - Syndrome سینڈروم [علامیہ]

مندرجہ بالا الفاظ کے مفہوم کچھ اس طرح ہوئے۔

"دوسری جگہ سے حاصل کیا گیا وہ عجیب علامیہ جو قدرت کی عطا کردہ بیماریوں سے مقابلہ کرنے والی قوت مدافعت کو کم کرتا ہو۔"

لہٰذا اردو زبان میں ہم ایڈز کو "اکتسابی قلت تحفظی علامیہ" سے موسوم کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قوت دافعہ کمزور ہونے پر جسم بہ آسانی مختلف بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے اور ان بیماریوں کی آماجگاہ بن کر آخرکار موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔

ایڈز کا قشب [وائرس]: تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ایڈز ایک چھوٹے وائرس [Virus] کے ذریعے پھیلتا ہے۔ یہ وائرس [Virus] اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ لیباریٹری میں دستیاب طاقتور خوردبین سے بھی دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے مشاہدے کے لیے الکٹرانک خوردبین کی ضرورت پڑتی ہے۔ طبی اصطلاح میں ایڈز کے وائرس کو ایچ آئی وی [HIV] کہتے ہیں۔ یہ لفظ یعنی ایچ آئی وی بھی انگریزی کے تین الفاظ ہیومن امیونو ڈیفی شینسی وائرس [Human Immuno-deficiency Virus] کا مخفف ہے۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہی ایڈز کے پھیلنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ایسا خطرناک اور سخت جان وائرس ہے کہ دیگر بیماریوں کے جرثوموں کو تباہ کرنے والی تمام دوائیں اور ضد حیوی [Antibiotics] وغیرہ اس وائرس کے لیے بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے خون میں سرخ مادّے کے ساتھ بڑی تعداد میں چھوٹے چھوٹے ذرات، یعنی کریات بیضا [WBC] موجود ہوتے ہیں، بیماری کے جرثوموں سے مقابلہ یا ان کو دفع کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی بیماری کے جراثیم [Bacteria]، فنجی [Fungus]، قشب [Virus] وغیرہ ہمارے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں، خون میں موجود کریات بیضا [WBC] ان کا گھیراؤ کرکے زیر کرلیتے ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے کریات بیضا [WBC] کی قوت گھٹ جاتی ہے تو جسم کی قوت مدافعت بھی کمزور پڑ جاتی ہے لہٰذا جسم بیماری کے جرثوموں سے متاثر ہوکر بیمار پڑ جاتا ہے۔ عام فہم زبان میں ایڈز کا وائرس یعنی ایچ آئی وی ایسا طاقتور جرثومہ ہے جس کا مقابلہ کرکے زیر کرنے میں کریات بیضا نہ صرف ناکام رہتے ہیں بلکہ ایچ آئی وی ان ہی کے درمیان رہ کر پروان چڑھتا ہے اور ساتھ ہی کریات بیضا کی قوت دافعہ کو مفلوج بھی کرتا رہتا ہے۔ ایک صحت مند جوان کے جسم میں ایک بار داخل ہونے کے بعد یہ وائرس تقریباً آٹھ سال کی مدت میں مکمل نشوونما پاجاتا ہے اور اس دوران جسم کی قوت دافعہ اس قدر مفلوج ہوچکی ہوتی ہے کہ وہ معمولی قسم کے دوسرے جرثوموں پر قابو پانے

کی بھی اہل نہیں رہ جاتی۔ دراصل اسی درجے تک پہنچنے پر کہا جاتا ہے کہ اس شخص کو ایڈز ہو گیا۔ پھر ایک سال سے تین سال کے اندر ہی وہ شخص مختلف بیماریوں کی تاب نہ لا کر لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایڈز وائرس کے کسی انسانی جسم میں داخل ہونے کے بعد پوری طرح پروان چڑھنے میں کتنی مدت لگتی ہے اس کا انحصار اس شخص کی اپنی صحت یعنی قوتِ دافعہ پر ہے۔ زیادہ بہتر صحت والے جوانوں میں یہ وقفہ بارہ سال تک ہو سکتا ہے جبکہ چھوٹے بچوں اور بڑی عمر کے بوڑھوں میں یہ وقفہ تین سے پانچ سال ہوتا ہے۔

ایڈز وائرس پر چونکہ نہ کوئی دوا کارگر ہے اور نہ انسانی جسم کی قوت دافعہ اس کا مقابلہ کر پاتی ہے اسی لیے مکمل نشوونما سے قبل بھی اگر یہ وائرس کسی طرح دوسرے شخص کے جسم میں پہنچ جاتا ہے تو اس کو بھی پہلے شخص کی طرح متاثر کرتا ہے۔

علامات: ابتدا میں ایڈز وائرس کے جسم میں داخلے کے بعد زیادہ تر افراد میں کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کو بھی بالکلیہ صحت مند دکھائی دیتے ہیں اور خود بھی اپنے آپ کو صحت مند ہی محسوس کرتے ہیں۔ چند سال بعد ان میں سے بعض میں مختلف علامات کا ظہور ہونے لگتا ہے، مثلاً دائمی بخار یا وقفے وقفے سے بار بار بخار آنا، کمزوری اور تھکاوٹ، وزن میں نمایاں کمی ہونا، دستوں کا جاری رہنا، گردن، بغل اور جانگھ کے نیچے گلٹیوں کا پیدا ہونا۔ اس سلسلے کی ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ کچھ افراد میں مذکورہ علامات تھوڑے وقفے کے بعد معدوم ہو جاتی ہیں لیکن کچھ عرصے بعد زیادہ شدت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ مریض کی قوت مدافعت کمزور ہوتی رہتی ہے اور اس پر ان جراثیمی بیماریوں کا حملہ بہ آسانی اور بار بار ہوتا رہتا ہے جو عام طور پر بغیر دوا کے یا معمولی علاج معالجے سے جلد دور ہو جاتی ہیں۔ چونکہ خون کی گردش کے ساتھ یہ وائرس پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اس لیے جسم کے تمام اعضا، بشمول دماغ، ان افعال کو جن کا تعلق خون کی صحت یا درستگی سے ہے، متاثر کرتا ہے۔ زیادہ تر ایڈز کے مریض مخصوص قسم کے نمونیہ یا کینسر کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔

کوئی شخص ایڈز وائرس کا شکار ہو چکا ہے یا نہیں؟ اس کی پہچان اس کے خون کی جانچ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ جانچ میں ایچ آئی وی موجود پائے جانے کی صورت میں کہا جاتا ہے کہ وہ شخص ایچ آئی وی مثبت (H.I.V. Positive) ہے۔ ایسا شخص بھلے ہی بظاہر تندرست دکھائی دیتا ہو یعنی وائرس کی نشوونما مکمل نہ بھی ہوئی ہو لیکن اس کا خون کسی ذریعے سے کسی دوسرے شخص کے جسم میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی ایچ آئی وی مثبت [H.I.V. Positive] بنا دے گا۔

ذرائع سرایت: ہر وہ شخص ایڈز کا مریض بن جائے گا جس کے جسم میں کسی بھی ذریعے سے ایچ آئی وی کی کوئی بھی مقدار داخل ہو جائے۔ ایک شخص سے دوسرے میں ایچ آئی وی کے منتقل ہونے کی مندرجۂ ذیل تین شکلیں ممکن ہیں:

[الف] کسی ایچ آئی وی مثبت شخص کے خون، پیپ یا خون سے تیار شدہ کسی مادے کا کسی صحت مند شخص کے جسم میں داخل ہونا۔

[ب] کسی ایچ آئی وی متاثر شخص کے مادۂ منویہ کا کسی بھی راستے سے کسی صحت مند شخص کے جسم میں منتقل ہونا۔

[ج] پیدائش سے قبل رحم مادر کے سیال مادے یا پیدائش کے بعد دودھ کے ذریعے ماں سے بچے کے جسم میں داخل ہونا۔

مذکورہ بالا شکلوں میں سے شروع کی دو شکلیں مندرجۂ ذیل طریقوں سے وجود میں آ سکتی ہیں:

1. کسی متاثرہ شخص کا خون یا پلازمہ کی کسی دوسرے صحت مند شخص میں منتقلی۔
2. کسی متاثرہ شخص کو انجکشن لگا کر، کان چھید کر یا جسم کے کسی حصے کو گودنے کے بعد سوئی کو جراثیمی اثر سے پاک کیے بغیر کسی صحت مند کے لیے استعمال کرنا۔
3. متاثرہ شخص کے شیو بنانے کے بعد بلیڈ کو یا آپریشن کرنے کے بعد سرجری کے آلات کو دافع عفونت تدابیر و احتیاط کے بغیر دوسرے کا استعمال کرنا۔
4. کسی ایسے متاثرہ شخص کا جس کے مسوڑھوں سے خون یا پیپ آتا ہو، کسی صحت مند شخص کو کاٹ لینا۔
5. کسی متاثرہ شخص [مرد یا عورت] کا کسی صحت مند شخص سے جنسی تعلق قائم ہونا۔
6. ٹسٹ ٹیوب بے بی کی بارآوری کی غرض سے کسی متاثرہ مرد یا عورت کا مادۂ منویہ کسی صحت مند عورت کے رحم میں منتقل کرنا۔
7. کسی متاثر شخص کے کسی عضو کی دوسرے شخص میں پیوندکاری۔

کن باتوں سے ایڈز نہیں پھیلتا؟ اگر ایڈز پھیلانے والی مذکورہ بالا کوئی شکل نہ ہو تو ایڈز نہیں پھیلے گا۔ لہٰذا مندرجۂ ذیل شکلوں میں ایڈز کا خطرہ نہیں ہے۔

1. کسی متاثرہ شخص کا جسم کسی دوسرے سے چھو جانے سے، مثلاً بوس و کنار یا مصافحہ کرنے سے۔
2. کسی متاثرہ شخص کی سانس، چھینک، تھوک یا پسینے سے۔
3. ایسی مباشرت سے جس میں مادۂ منویہ فریق ثانی کے جسم میں داخل نہ ہو۔
4. کھٹمل، مچھر، پسو وغیرہ کے متاثر شخص کو کاٹنے کے بعد غیر متاثر کو کاٹنے سے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ کسی معالج یا تیماردار کو ایڈز سے متاثر شخص سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

علاج: تادمِ تحریر ایڈز وائرس [AIDS Virus] کو ختم کرنے یا قابو میں کرنے کی کوئی مؤثر دوا یا ویکسین [Vaccine] ایجاد نہیں ہو سکی ہے، البتہ قوتِ مدافعت کمزور ہونے کے نتیجے میں جو امراض پیدا ہو جاتے ہیں ان کا علاج کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مریض کا عرصۂ حیات کچھ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جب وائرس جسم میں پوری طرح پروان چڑھ چکا ہوتا ہے تو یہ وقفہ سال دو سال سے زائد نہیں ہوتا، کیوں کہ ایک طرف تو قوتِ مدافعت انتہائی لاغر ہو چکی ہوتی ہے اور دوسری طرف جو دوائیں دیگر امراض کے ازالے کے لیے دی جاتی ہیں وہ بھی زہریلی [Toxic] ثابت ہونے لگتی ہیں اور نقصان دہ ذیلی اثرات [effects side] پیدا کرنے لگتی ہیں۔ اسی لیے تمام ممالک میں جہاں ایک طرف ایڈز کی کامیاب دوا یا ویکسین (Vaccine) ایجاد کرنے کی کوشش جاری ہے وہیں کروڑوں بلکہ اربوں روپے سالانہ عوام الناس کو ایڈز سے بچاؤ کے طریقوں کی مشتہری پر صرف کیے جا رہے ہیں۔

ایڈز سے بچاؤ: مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے سے ایڈز کے پھیلاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔

[1] خون یا پلازمہ چڑھانے سے قبل اس کا ایچ آئی وی ٹسٹ ضرور کرایا جائے۔

[2] انجکشن کے لیے جراثیم سے پاک یا نئی سرنج ہی استعمال کی جائے۔

[3] حجامت اور شیو بنواتے وقت دوسروں کے استعمال شدہ بلیڈ سے گریز کیا جائے۔

[4] جنسی آسودگی کے حصول کے لیے حرام کاری اور لواطت جیسے ناجائز طریقوں سے بالکلیہ اجتناب کیا جائے۔

[5] اگر زن و شو میں سے کوئی ایچ آئی وی مثبت ہو تو مقاربت کے وقت رفالہ [کنڈوم] لازمی طور پر استعمال کیا جائے۔

[6] اگر کسی دوسرے کے عضو کو پیوند کاری کے لیے استعمال کرنا ہو تو پہلے اس شخص کے ایچ آئی وی مثبت نہ ہونے کا اطمینان کر لیا جائے۔

[7] بچے کو کسی ایسی عورت کا دودھ نہ پلایا جائے جس پر ایچ آئی وی مثبت ہونے کا شبہ ہو۔

ایڈز سے متعلق اخلاقی و معاشرتی ذمے داریاں:

1. کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہونے پر کہ وہ ایچ آئی وی مثبت ہے، اس کے چال چلن کے بارے میں بلا تحقیق کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ یہ درست ہے کہ 85 فی صد افراد جنسی بے راہ روی کی بدولت ہی اس موذی عارضے کا شکار ہوتے ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ وہ شخص بقیہ 15 فی صد کے زمرے میں آتا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ لاپرواہ حجام کے استرے یا لاپرواہ کمپاؤنڈرز کے انجکشن کی سوئی کے ذریعے ایچ آئی وی سے متاثر ہوا ہو۔

2. اگر کسی کو اپنے بارے میں علم ہو جائے کہ خدانخواستہ وہ ایچ آئی وی مثبت ہے تو شریکِ حیات سے بغیر رفالہ [Condom] جنسی تعلق قائم نہ کرنا چاہیے۔

3. خود کو اور آئندہ نسل کو اس موذی عارضے سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے خاندانوں میں رشتہ کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے جہاں عریانیت، بے باکی، فحاشی وغیرہ موجود ہوں کیوں کہ وہاں جنسی بے راہ روی او رایڈز سے متاثرہ افراد کا ہونا عین ممکن ہے۔

4. چونکہ ایڈز سے متاثرہ شخص کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا کھانے پینے سے یہ عارضہ اس کے معالج یا تیماردار میں منتقل نہیں ہوتا اس لیے ایڈز کے مریضوں کی تیمارداری میں کوتاہی نہ کریں۔ ایڈز کے مریض کا تمام خون تبدیل کر دینے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیوں کہ وائرس مادہ منویہ وغیرہ میں بھی موجود ہوتا ہے اس لیے وطن پرستی اور انسان دوستی کا تقاضہ ہے کہ عوام و خواص کو ان برائیوں سے بچانے کی فکر کی جائے جن کی بدولت اکثر افراد اس خطرناک عارضے کا شکار ہوتے ہیں۔

□□□

پتہ:
C-2 Naseem Manzil, Madehganj Police Post,
Sitapur Road, Lucknow-226020

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

فاروق احمد درویش پوری

پرائیویٹ سیکٹر میں کیریئر کے امکانات

ایک وقت تھا کہ 12ویں کے نتائج کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا جاتا تھا اور کوشش یہی کی جاتی تھی کہ 90 فیصد نمبر آ ہی جائیں، تاکہ کیریئر کا انتخاب اپنی پسند کے مطابق کر سکیں۔ لیکن کم نمبر حاصل کرنے والے طلبہ حد درجہ مایوسی کا شکار ہو جاتے تھے۔ جب کہ آج حالات یکسر مختلف ہیں۔ آج کے دور میں زیادہ سے زیادہ نمبر لانے والے ہی نہیں کم نمبر لانے والے طلبہ بھی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ آج دنیا بھر میں معاشرتی اور اقتصادی سطح پر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کے سبب بہت سارے شعبے تیزی سے ابھر کر سامنے آ رہے ہیں، جہاں کیریئر کو سنوارا جا سکتا ہے۔ لیکن ان نئے سیکٹروں میں عدم واقفیت کے باعث ابھی کیریئر بنانے کی ہوڑ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ریٹیل، ریئل اسٹیٹ، ہاسپٹلٹی، فائننشل سروس مارکیٹنگ، پبلک ریلیشنز اور ایونٹ مینجمنٹ جیسے سیکٹر اس کے گواہ ہیں۔ جب کہ کچھ اور سیکٹر بھی آگے آنے کی دوڑ میں شامل ہیں اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان سیکٹروں کو صرف سند یافتہ (Degree Holders) نوجوانوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ماہر پیشہ وروں کی ضرورت ہے جنھیں انڈسٹری کی باریکیوں کی جانکاری ہو۔ لہٰذا نوجوان ان شعبوں میں تھوڑی سی محنت کے بعد نہ صرف یہ کہ نوکری پا سکتے ہیں بلکہ ان کو اچھی تنخواہ اور پرکشش پیکج بھی مل سکتا ہے۔ لہٰذا اب ان پر ایک طائرانہ نظر۔

ریٹیل (Retail) آج مختلف کثیر ملکی کمپنیوں کو ہندوستان ایک بڑے صارف بازار کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں ریٹیل سیکٹر دو کروڑ سے زیادہ آؤٹ لیٹ (Outlet) کے ذریعے پانچ ہزار کروڑ روپے کا کاروبار کر رہا ہے اور آنے والے دنوں میں اس شعبے میں ایک لاکھ نئے روزگار میسر ہوں گے۔ میکنیزی کی ایک رپورٹ کے مطابق 2010 تک کنزیومر مارکیٹ (Consumer Market) چار سو بلین ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ اگر ایسا ہوگا تو ہندوستان اس سیکٹر کے سرفہرست پانچ طاقتور ممالک میں شامل ہو جائے گا۔ یہ شعبہ منافع حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے جتنا اہم ہے اتنا ہی روزگار کے مواقع کے لحاظ سے بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وال مارٹ بھارتی اور ریلائنس ہندوستانی معاونین کے ساتھ مل کر ریٹیل اسٹورز (Retail Stores) کھولنے کی تیاری میں ہیں، جب کہ پنٹالون، وشال اور بگ بازار وغیرہ بڑی تیزی کے ساتھ اس شعبے میں کامیابی کی نئے سنگ میل رقم کر رہی ہیں۔ یہاں مرکیڈائزنگ، اسٹور مینجمنٹ، خریداری اور Online Retailing کاموں کے لیے ماہر پیشہ ور افراد کی بڑی مانگ ہے۔

ریئل اسٹیٹ (Real Estate) ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے سبب جو شعبے تیزی سے روزگار کے نئے نئے مواقع پیدا کر رہے ہیں، ان میں سے ایک Real Estate بھی ہے۔ DLF اور Unitech Group وغیرہ نے اس شعبے کو کافی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بین الاقوامی سرمایہ کاروں، خاص طور سے مڈل ایسٹ، ساؤتھ ایسٹ ایشیا اور یوروپ ہندوستانی بازار کے شیدائی ہو گئے ہیں۔ گذشتہ تین سالوں میں 40 فیصد اضافہ درج کیا گیا اور 2010 تک اس شعبے کی مالیت 60 بلین ڈالر تک پہنچنے کی امید ہے۔ اس طرح اس شعبے میں پروجیکٹ منیجروں اور آرکیٹکٹوں کے ساتھ ہی مارکیٹنگ کے لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔

ہاسپٹلٹی (Hospitality) دی ریڈرز ٹریویل ایوارڈس 2006 نے ہندوستان کو دنیا کے سب سے پرکشش چار ممالک میں شمار کیا ہے، جو 2003 میں نویں مقام پر تھا۔ سیاحت یا موج مستی کے لیے آنے والے سیاحوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ میزبانی (Hospitality) کے نامور سرمایہ کار بڑے پیمانے پر ہندوستان میں اپنے توسیعی منصوبوں کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ اس صنعت میں Marketing, Front House, House Keeping ایسے شعبے ہیں، جن میں ماہرین کی بڑی تعداد کی کھپت ہو سکتی ہے۔

فائننشل سروس مارکیٹنگ (Financial Service Marketing) بڑھتی آمدنی کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بچت کرنے کا رجحان بھی بڑھا ہے۔ Mutual Fund، Bond اور Stock کی خریداری میں تیزی آئی ہے۔ لیکن اس شعبے میں ماہر پیشہ وروں کی بہت کمی بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ دراصل ہمارے طلبہ ابھی تک اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ جب کہ مختصر مدتی کورس کی تکمیل کے بعد ہی اچھی تنخواہ پر نوکری مل سکتی ہے۔ حکومت بھی ٹیکس دہندوں کا دائرہ بڑھا کر اس شعبے کو فروغ دے رہی ہے۔

رابطۂ عامہ (Public Relation) سرکاری اور کارپوریٹ سیکٹر کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے ایسے افراد کی ضرورت پڑتی ہے، جو پرکشش

شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ہی اپنی بات کو عمدہ طریقے سے دوسروں تک پہنچا سکیں۔ لہٰذا آج رابطۂ عامہ کا شعبہ وقت کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر کمپنی اپنا ایک رابطۂ عامہ افسر رکھتی ہے۔ یہ رابطۂ عامہ افسر عوام او رکمپنی کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔

ایونٹ مینجمنٹ (Event Management) کثیر قومی کمپنیوں کے آنے سے جو شعبے تیزی سے ابھر کر سامنے آئے ہیں، ان میں سے ایک Event Management بھی ہے جہاں روزگار کے بہت مواقع موجود ہیں۔ اس شعبے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی تربیت حاصل کرنے کے بعد کارپوریٹ سیکٹر کی بہت سی کمپنیوں میں روزگار مل سکتا ہے تو دوسری جانب آپ خود اپنا کاروبار بھی شروع کرسکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا طرز فکر بھی بدل رہا ہے اور آج تقریباً ہر Event کے لیے Event Mangement Company کی خدمات لی جانے لگی ہیں، جو یوم پیدائش سے لے کر دولہے کی گھوڑی تک کا سارا انتظام خود کرتی ہیں۔ ساتھ ہی فیشن شو، پریمیئر شو، پروڈکٹ لانچنگ، زیورات کی نمائش، کارپوریٹ سیمینار اور رقص و موسیقی کے پروگرام کی کامیابی کا دارومدار بھی ایک ماہر Event Management کمپنی کے کندھوں پر ہی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں Event Industries کا کاروبار تقریباً 527 کروڑ روپے کا ہے اور اس صنعت میں 500 کروڑ روپے کا سالانہ ٹرن اوور ہونے کے سبب نوجوانوں کے لیے روزگار کے کافی مواقع موجود ہیں۔

Aviation ملک کے گیارھویں پنج سالہ منصوبے میں ہندوستان کو 5400 پائلٹوں کی ضرورت ہوگی۔ ساتھ ہی آج کل بڑی تعداد میں کئی ایرلائنز وجود میں آرہی ہیں اور کئی سو کی تعداد میں ایربسوں اور ہیلی کاپٹروں کی شمولیت کے بعد سے پائلٹوں کے ساتھ ساتھ کئی دیگر پیشہ وروں مثلاً کنٹرولروں، انجینئروں اور زمینی کارندوں وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح اس شعبے میں بھی اچھے مواقع موجود ہیں۔

اشتہار (Advertisement) آج کا دور اشتہاریت کا ہے۔ کوئی کمپنی جتنے بہترین پروڈکٹ تیار کرے، لیکن وہ اشتہار کا سہارا نہ لے تو اس سے کم کوالٹی کی چیزیں کہیں اچھا بزنس دے دیتی ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں اپنے سامان کی فروخت کے لیے اشتہار کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ یہ شعبہ کارپوریٹ سیکٹر کے لیے نئے نئے پرکشش اشتہار تیار کرتا ہے۔ اس طرح جب اشتہار کے بغیر زندگی کا کوئی بھی شعبہ آگے نہیں بڑھ سکتا، تو کیریئر کا میدان اس سے اچھوتا کیونکر رہ سکتا ہے۔

ویب ڈیزائنر (Web Designer) آج کا دور انفارمیشن ٹیکنالوجی اور مینجمنٹ کا ہے۔ لیکن یہاں ایک بات بطور خاص یاد رکھنے کی ہے کہ مینجمنٹ کا ہر شعبہ کمپیوٹر سے منسلک ہوتا ہے اور کمپیوٹر کی بنیادی معلومات سے واقفیت ہر ایک کے لیے ضروری ہے، جب کہ IT والوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے پاس مینجمنٹ کی ڈگری بھی ہو۔ ساتھ ہی ہر کمپنی کے اپنے پروڈکٹ ہوتے ہیں، اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں اور کام کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے، جس کے مطابق اسے کمپیوٹر پر لوڈ کرنے کے لیے ماہر ویب ڈیزائنر کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً بازار کے حساب سے اپنے ویب کو اپ ڈیٹ (Up to date) بھی کرتے رہنا پڑتا ہے۔ جو ویب ڈیزائنر ہی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ شعبہ بھی موجودہ دور کا ایک بہترین شعبہ ہے۔

پتہ:
82, Hospoital Road,
Kamarhatty Sharif,
Kolkata-700058

□□□

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھگتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔

''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

محمد اعجاز

فرضی اداروں سے کیسے بچیں

ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی بڑھتی تعداد کو دیکھتے ہوئے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے شہروں تک میں ہر طرح کے تکنیکی اور غیر تکنیکی اداروں کی بھی باڑھ آگئی ہے۔ ایسی صورت میں کون سا ادارہ اصلی ہے اور کون سا نقلی، اس کی شناخت کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ادارے اپنے بارے میں بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، لوگوں کو لبھانے کے لیے بڑے بڑے اشتہارات شائع کرتے ہیں۔ طلبہ کو اصلیت کا پتہ تب چلتا ہے جب وہ وہاں داخلہ لے چکے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ اپنا داخلہ منسوخ کروانا چاہتے ہیں تو لی گئی فیس لوٹانے میں ادارے کے ذریعے آناکانی کی جاتی ہے۔ اس طرح کے فرضی ادارے خاص طور پر پیشہ ورانہ کورس چلانے والے ادارے زیادہ ہیں۔ آج کل ایسے ادارے بھی دکھائی دیتے ہیں جو تنگ عمارتوں میں چلتے ہیں اور بی.اے. سے لے کر ایم.بی.اے. تک اور انجینئرنگ سے لے کر میڈیسین تک ہر طرح کا کورس کرانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں شک پیدا کرتا ہے کہ کوئی ایک ادارہ الگ الگ اسٹریم کے ڈھیر سارے کورس کیسے چلا سکتا ہے۔

کون سا اصلی کون سا نقلی

کون سا تعلیمی ادارہ اصلی ہے اور کون سا نقلی، اس بارے میں پہلے سے صحیح صحیح پتہ لگانا کافی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن والدین کے گاڑھے پسینے کی کمائی، مہنگی پڑھائی میں لگانے سے پہلے ایسے اداروں کی جانچ کرنا آج بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے تو آپ جس ادارے میں داخلہ لینا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں جانکاری سیدھے اس سے لینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اگر کوئی سرکاری محکمہ ایسے اداروں کی منظوری کے لیے ذمے دار ہے تو اس سرکاری محکمے کی ویب سائٹ سے اس ادارے کے بارے میں جانکاری حاصل کریں۔

کریں ادارے کا انتخاب

☆ پتہ کریں کہ آپ جو کورس کرنا چاہتے ہیں، اس کے مقبول عام ادارے کون کون ہیں۔

☆ منتخب ادارے کے استناد اور پڑھائی کے معیار کے بارے میں وہاں سے کورس کر چکے طلبہ سے پتہ کرنے کی کوشش کریں۔

☆ چمک دمک سے متاثر نہ ہوتے ہوئے کورس کی خوبی اور ادارے کے معیار کو اہمیت دیں۔

☆ کم فیس یا گھر کے قریب ہونے بھر سے ہی داخلہ نہ لیں بلکہ ادارے کی مقبولیت پر دھیان دیں۔

☆ اگر کسی اچھے ادارے میں اس سال داخلہ نہیں مل پاتا تو فکرمند ہونے کی بجائے مزید تیاری کر کے خود کو اس کے لائق بنائیں۔

ان امور پر توجہ دیں:

اگر آپ فرضی اداروں سے بچنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اداروں کے انتخاب پر توجہ دیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے ادارے سے سیدھا رابطہ پیدا کریں اور مطلوبہ جانکاری حاصل کریں۔

ادارے کے کورسوں کو منظوری دینے والی کونسل کی ویب سائٹ پر ادارے کی حالت کو جانچیں۔

☆ اچھے ادارے، رابطے کے لیے کئی فون لائنیں مہیا کراتے ہیں، جبکہ مشکوک ادارے عام طور پر ایک یا دو لائن کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں بھی کئی بار لینڈ لائن نمبر نہیں ہوتا۔

☆ جعلی اداروں کی ویب سائٹ پر متضاد باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ ان کے کورسوں کو غیر ملکی ادارے سے منظوری حاصل ہے، تو کبھی ان کا کہنا ہوتا ہے کہ انھیں جلد ہی منظوری مل جائے گی۔ جبکہ معتبر ادارے اپنی منظوری کے بارے میں واضح طور پر بتاتے ہیں۔

☆ جعلی ادارہ اکثر باوقار ملکی یا غیر ملکی اداروں سے ملتا جلتا نام رکھ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہندوستان میں الگ الگ شعبوں سے متعلق تعلیمی اداروں کو منظوری دینے اور ان پر قابو رکھنے کے لیے کئی کونسلیں قائم ہیں۔ کوئی ادارہ اصلی ہے یا نقلی، اس کی جانچ کرنے کے لیے ان کی ویب سائٹ دیکھی جا سکتی ہے یا پھر ان سے سیدھے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC)

بھارت سرکار کے ذریعے قائم شدہ یہ ادارہ ملک کی سبھی یونیورسٹیوں پر نظر رکھنے، ان کو منظم کرنے اور نئی یونیورسٹیوں کو منظوری دینے کا کام کرتا ہے۔ طلبہ کو جعلی اداروں سے بچانے کے لیے یہ وقتاً فوقتاً ایسے اداروں کی فہرست بھی جاری

کرتا ہے۔ کوئی یونیورسٹی فرضی ہے یا نہیں اس کی جانچ اس کی ویب سائٹ سے کی جاسکتی ہے۔ ویب سائٹ www.ugc.ac.in

آل انڈیا کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن (AICTE)

بھارت میں تکنیکی اداروں کو کھولنے، ان کے ذریعے نئے کورس چلانے اور ان کی تصدیق کرنے کا کام اے آئی سی ٹی ای کرتی ہے۔ اس کے سات ریجنل دفاتر سے رابطہ کرکے تکنیکی اداروں کی جانکاری حاصل کی جاسکتی ہے۔

ویب سائٹ: www.aicte.emet.in

نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (NCTE)

1993 میں قائم شدہ این سی ٹی ای کا کام ملک میں ٹیچر ایجوکیشن نیٹ ورک کو چلانا اور منظم کرنا ہے۔ کونسل ٹیچر ٹریننگ کا کورس چلانے والے اداروں کو منظوری بھی دیتی ہے۔ یہاں سے بی ایڈ، ایم ایڈ، وغیرہ کورسوں اور اس سے متعلق اداروں کی جانکاری بھی لی جاسکتی ہے۔ اس کے ریجنل دفاتر بھوپال، جے پور، بنگلور اور بھونیشور میں ہیں۔

ویب سائٹ: www.ncte.in.org

ڈسٹنس ایجوکیشن کونسل (DEC)

اس کی بنیاد فاصلاتی تعلیم اور اوپن یونیورسٹی سسٹم کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس کی منظور شدہ یونیورسٹیوں کی جانکاری ڈی ای سی سے لی جاسکتی ہے۔

ویب سائٹ: www.dec.ac.in

بار کونسل آف انڈیا (BCI)

یہاں سے ملک میں قانون سے متعلق سبھی اداروں کے بارے میں جانکاری حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ قانون تعلیم کے شعبے کے بارے میں نہ صرف بتا دیتی ہے، بلکہ سدھار کے لیے قدم بھی اٹھاتی ہے۔

ویب سائٹ: www.barcouncilofindia.nic.in

انڈین کونسل فار ایگریکلچرل ریسرچ (ICAR)

زراعت کے شعبے میں ریسرچ اور نئی کھوجوں کے لیے پابند آئی سی اے آر ایگریکلچر یونیورسٹیوں اور اداروں کو مالی امداد بھی مہیا کراتی ہے۔ اس سے زراعت سے متعلق کورس چلانے والے اداروں کی جانکاری لے سکتے ہیں۔

ویب سائٹ: www.icar.org.in

میڈیکل کونسل آف انڈیا (MCI)

یہ طب سے متعلق کورسوں کو چلانے والے اداروں کو منظم کرتی ہے۔ اس کے ذریعے میڈیکل شعبے کے اداروں کے بارے میں جانا جاسکتا ہے۔

ویب سائٹ www.mcindia.org

سنٹرل کونسل فار انڈین میڈیسین (CCIM)

بھارت کی روایتی طبی تعلیم کے طریقوں آیوروید اور یونانی وغیرہ سے متعلق کورسوں اور انھیں چلانے والے اداروں کی جانکاری اس کونسل سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ویب سائٹ: www.ccimindia.org

سنٹرل کونسل آف ہومیوپیتھی (CCH)

ہومیوپیتھی سے متعلق کورس چلانے والی یونیورسٹیوں اور اداروں کو منظوری دیتی ہے۔ اس کے لیے ان اداروں کو اپنے کورس، انفراسٹرکچر اور امتحان سے متعلق ہر طرح کی جانکاری کونسل کو فراہم کرنا ہوتی ہے۔

ویب سائٹ: www.cchindia.com

فارمیسی کونسل آف انڈیا (PCI)

ڈی فارما، بی فارما جیسے کورس کرانے والے ادارو ں کے بارے میں جانکاری کے لیے پی سی آئی سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

ویب سائٹ: www.pci.nic.in

ڈینٹل کونسل آف انڈیا (DCI)

بی ڈی ایس، ایم ڈی ایس جیسے ڈینٹل کورس چلانے والے اداروں کی جانکاری ڈی سی آئی سے مل سکتی ہے۔

ویب سائٹ: www.dcindia.org

انڈین نرسنگ کونسل (INC)

نرس، مڈوائف، ہیلتھ وزیٹر وغیرہ سے متعلق کورس (جیسے نرسنگ میں ڈپلوما، ڈگری، پی ایچ ڈی وغیرہ) چلانے والے منظور شدہ اداروں کے بارے میں آئی این سی سے جانکاری حاصل کی جاسکتی ہے۔

ویب سائٹ www.indiannursingcouncil.org

کونسل آف آرکیٹکچر (COA)

آرکیٹکچر سے متعلق کورس چلانے والے اداروں کی منظوری سے متعلق جانکاری اس کونسل سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ویب سائٹ: www.coa.gov.in

ادارہ

اس بات کو جاننا بھی ضروری ہوتا ہے کہ آپ جس ادارے میں داخلہ لینے جارہے ہیں، اس کا معیار کیا ہے یعنی وہ ڈائرکٹ یونیورسٹی ہے، آف شور کیمپس ہے، یا پھر صرف اسٹڈی سنٹر۔

مرکزی یونیورسٹی

مرکزی یونیورسٹی بھارت سرکار کے پارلیمانی ایکٹ کے تحت قائم کی جاتی ہے، جس کے چانسلر عام طور پر بھارت کے صدر ہوتے ہیں۔ اسے مرکزی حکومت سے امداد ملتی ہے۔

ریاستی یونیورسٹی

ریاستی یونیورسٹی متعلقہ ریاست کے ذریعے قائم کی جاتی ہے اور چلائی جاتی ہے۔ اسے یو جی سی سے منظوری اور امداد ملتی ہے۔ اس کے چانسلر وہاں کے گورنر ہوتے ہیں۔

نجی یونیورسٹی

سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ 1860 کسی ریاست کے قانون یا کمپنی ایکٹ 1956 کی شق 25 کے تحت ریاست یا سنٹرل ایکٹ کے تحت کسی منصوبے کے بانی کے ذریعے قائم یونیورسٹی۔ ریاستی ایکٹ کے تحت قائم پرائیویٹ یونیورسٹی اس ریاست کی حد میں ہی چلائی جاسکتی ہے۔

اسٹڈی سنٹر

یونیورسٹی کے ذریعے خاص طور پر فاصلاتی تعلیم کے تحت طلبہ کی مدد کے لیے تشکیل دیا گیا تسلیم شدہ مرکز۔

آف شور کیمپس

پرائیویٹ یونیورسٹی کے ذریعے بیرونی ملک میں قائم اور چلایا جانے والا کیمپس۔

آف کیمپس سنٹر

پرائیویٹ یونیورسٹی کے ذریعے صدر کیمپس سے باہر اسی ریاست یا کسی دوسری ریاست میں چلایا جانے والا سنٹر۔

پتہ:
S/o Abdul Waris,
Raja Tola, Harlakhi,
Via-Umgaon, Kothi, Madhubani,
Bihar-847225

□□□

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''نئی شعری روایت'' نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت: -/127 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نسیم احمد نسیم

احمد یوسف سے آخری گفتگو

جناب احمد یوسف مرحوم سے یہ گفتگو مارچ 2008 کی دو تاریخوں (15,13) میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔ مرحوم ان دنوں علیل تھے لیکن دو دنوں کی لمبی لمبی نشستوں کے دوران انھوں نے ایک دفعہ بھی اپنی علالت کا ذکر نہیں کیا۔ پوری دلچسپی سے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ درمیان میں ہنستے بھی رہے، پُر مزاح فقرے بھی ادا کرتے رہے۔ میری کچھ ذاتی مصروفیات کے سبب یہ انٹرویو فوری طور پر شائع نہیں ہو سکا۔ یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی داغِ مفارقت دے جائیں گے:

اچھے لوگوں سے ہوئی جاتی ہے دنیا خالی

خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

پیش ہیں اس طویل انٹرویو کے کچھ خاص حصے۔

● محترم احمد یوسف صاحب ہمیں اپنے ابتدائی احوال سے آگاہ فرمائیں۔

● میں 1930 میں پٹنہ سٹی (صدر گلی) میں پیدا ہوا۔ 1934 میں زلزلہ آیا۔ زلزلے کی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کے بعد میرے والد سید محمد یوسف اپنے خاندان کے ساتھ کلکتہ منتقل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے سائکل ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس شروع کیا۔ میرے والد بزنس کے ساتھ ساتھ کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت بھی کیا کرتے تھے:

● کچھ اپنے تعلیمی سلسلے میں فرمائیں؟

● 1935 میں میرا داخلہ مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں ہوا۔ ہم ڈاکٹر لین میں رہتے تھے۔ یہاں سے مدرسہ بہت قریب تھا۔ وہاں 1935 سے 1939 تک زیر تعلیم رہا۔ میرے دادا اور دادی پٹنہ میں ہی تھے۔ جب میری دادی کا انتقال ہوا تو دادا نے ہمیں واپس پٹنہ بلا لیا۔ پٹنہ میں میری اسکولی تعلیم محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول میں ہوئی۔ اس وقت ہائی اسکول کی ڈگری بھی یونیورسٹی سے ہی ملتی تھی۔ 1943 میں میں نے گیارھویں جماعت پاس کی۔ اس کے بعد میرا داخلہ 1944 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔ وہاں سے میں نے I.Sc. B.Sc کیا۔ اس کے بعد پٹنہ واپس آ گیا اور بہار ہی سے ایم۔اے (اردو) اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کیا۔

● جب آپ علی گڑھ میں تھے، اسی زمانے میں ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے وقت یونیورسٹی کا ماحول کیسا تھا؟

● تقسیم کے اثرات جس طرح ملک کے دوسرے شہروں اور قصبوں پر پڑے ویسے حالات یونیورسٹی کیمپس میں نہیں تھے۔ ملک میں جو خونیں واقعات ہو رہے تھے، ان کی خبریں ملتی تھیں۔ کبھی کبھی سراسیمگی کا ماحول بھی بن جاتا تھا لیکن یونیورسٹی انتظامیہ ہمہ وقت ماحول کو بگڑنے سے بچانے کے جتن کرتی رہتی تھی۔ 1948 میں گاندھی جی کے قتل کے بعد کافی ہنگامہ برپا ہوا۔ پورے ملک کی طرح علی گڑھ بھی مغموم تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے آنجہانی کو 31 سائرن کی سلامی دی گئی۔ لیکن تقسیم کے بعد بہت کچھ بدل گیا۔ جو لڑکے ملک کے ان حصوں سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان میں چلے گئے تھے، وہ اپنے نئے ملک کو واپس ہو گئے۔ دوسرے لڑکے بھی لگتا تھا بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا جو برسوں بعد ختم ہوا۔

● معروف شاعر حسن نعیم مرحوم آپ کے نسبتی بھائی تھے، کچھ ان کے متعلق فرمائیں۔

● دیکھیے جناب! وہ شاعر آدمی تھے۔ دنیاداری کے معاملات میں بالکل کورے۔ جب پٹنہ میں ہمارا کاروبار ٹھپ ہونے لگا تو میں 1973 میں دہلی چلا گیا اور حسن نعیم صاحب کو بزنس میں شریک کیا۔ ابتدا میں تو ٹھیک ٹھاک رہا لیکن ان کی عدم دلچسپی کے سبب بزنس ختم ہو گیا۔ اس کے بعد پلاسٹک انڈسٹری شروع کی گئی لیکن اس کا بھی حشر حسب سابق ہوا۔ یعنی ایک طرف ایک فکشن نگار اور دوسری طرف ایک سرتاپا شاعر! نتیجہ ظاہر ہے جو ہونا تھا ہوا۔

● آپ کی زندگی کا ایک طویل حصہ خدا بخش لائبریری میں گزرا۔ وہاں آپ نے کون کون سی اہم ذمے داریاں نبھائیں؟

1984 میں اس وقت کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار صاحب کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ انھوں نے مجھے ایک پروجیکٹ دیا کہ اخبارات سے ایسے محاورے یکجا کیے جائیں جو خالصتاً بہاری ہوں اور سند کے ساتھ ہوں۔ میں نے کافی چھان بین کے بعد 3500 محاورے جمع کیے جو آگے چل کر "بہار اردو لغت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے ترجمے کے بہت سے کام کیے۔ صلاح الدین خدا بخش، راج موہن گاندھی، سروائی، سروجنی نائیڈو اور کملا پرساد کی کتابوں کے اردو ترجمے کیے۔ کچھ شائع ہوئے، کچھ ہنوز التوا میں ہیں۔

● آپ کی افسانہ نگاری کا آغاز کیسے اور کن حالات میں ہوا؟

● میں علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں رشید احمد صدیقی سے بہت متاثر تھا۔ ان کی نثر مجھے بہت اپیل کرتی تھی۔ یہ 1946 کی بات ہے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ ان کی طرح انشا کی خوبیوں سے بھرپور نثر لکھنا مجھے بھی آ جائے لیکن ان کا اتباع آسان کام نہ تھا۔ ان دنوں احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور بیدی کی افسانہ نگاری کا کافی شہرہ تھا۔ میں ان سے بھی متاثر تھا۔ میں نے 1948 سے باضابطہ لکھنا شروع کیا۔ میری پہلی کہانی کلام حیدری کے ماہانہ رسالے

"آہنگ" (گیا) میں "عبدالرحیم ٹی اسٹال" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کہانی کا بہت چرچا ہوا۔ افسانہ نگاروں اور نقادوں کی توجہ میری طرف ہوئی۔ تب سے لے کر آج تک میں برابر افسانے لکھتا رہا۔ میرے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

● کلام حیدری کے ذکر پر خیال آیا کہ وہ آپ کے مداح تھے اور یہ بات غیاث احمد گدی کو پسند نہ تھی۔

نسیم صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ غیاث ایک بہت بڑے فن کار تھے اور اپنے ہم عصروں میں لیڈنگ افسانہ نگار۔ کلام حیدری کے معترف تھے۔ وہ جن افسانہ نگاروں کو "آہنگ" کے ذریعے پروموٹ کرتے تھے جن میں غیاث احمد گدی بھی تھے، الیاس احمد گدی بھی تھے، میں بھی تھا اور دوسرے بھی کئی تھے۔ لیکن غیاث احمد گدی complex کا شکار تھے۔ وہ دوسروں کی شہرت پسند نہیں کرتے تھے۔

● یوسف صاحب! آپ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بہت فعال رہے۔ بعد میں جدیدیت کے بھی حامی ہوگئے۔ آخر ادب کے تئیں آپ کا بنیادی رجحان کیا ہے؟

● یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی تخلیقی فنکار کو ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ آرٹسٹ ہے اور سچا آرٹسٹ کبھی بھی کسی رجحان یا نظریے کا قیدی بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں نے کبھی وہ راستہ نہیں اپنایا جو مجھے افسانہ نگار سے مبلغ اور پرچارک بنا دے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں فن پاروں میں، حقیقی زندگی کو اس کے ہر رنگ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔

● آپ کے معاصرین میں کون کون سے افسانہ نگار تھے جنھیں آپ پسند کرتے تھے یا جن سے آپ کے روابط رہے؟

● میرے ساتھ کے لکھنے والوں میں رام لعل تھے، الیاس احمد گدی تھے، جوگندر پال، اقبال متین بھی تھے۔ پال اور اقبال متین نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ اپنے ہم عصروں سے مختلف تھے۔ نیا اسلوب اختیار کرتے تھے، تجربے کرتے تھے۔ رام لعل کے یہاں story value زیادہ ہونے کے سبب قارئین اور ناقدین کا ایک طبقہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اقبال متین کے افسانوں کی فضا الگ ہے۔ زبان بہت ستھری ہے۔ جیلانی بانو کے یہاں مقامی رنگ زیادہ ہے۔ قرۃ العین نے جو تجربے کیے وہ ان سے مخصوص ہیں۔ ان جیسا ویژن کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ بہت وسیع النظر اور وسیع المطالعہ تھیں۔ ان کا کینواس شاید سب سے بڑا تھا۔

● یوسف صاحب کچھ اپنے بعد کے افسانہ نگاروں کے متعلق بھی فرمائیں۔

● میرے بعد آنے والوں میں حسین الحق، شوکت حیات، عبدالصمد، انور خاں، شفق، ساجد رشید، عبید قمر، شموئل احمد، غضنفر، انیس رفیع، علی امام نقوی، پیغام آفاقی، سید محمد اشرف، مشتاق احمد نوری، طارق چھتاری، قاسم خورشید، مشرف عالم ذوقی، شاہد اختر، بیگ احساس، محمد ذاکر اور کئی دوسرے لوگ ہیں۔ بعض لوگ بہت سنجیدہ اور پختہ ہیں لیکن کچھ لوگوں کی تحریریں اپیل نہیں کرتیں۔ شموئل احمد چونکا دینے کے ارادے سے لکھتے ہیں۔ یہ چیزیں بہت دنوں تک نہیں چل پاتیں۔ سطح زمین پر آنا ہی پڑتا ہے۔ اب منٹو، عصمت والی دنیا یکسر بدل گئی ہے۔ اب حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

● محترم! یہ تو افسانہ نگاروں کی بات ہوئی۔ اب افسانے کی تنقید کی بابت بھی کچھ فرمائیں۔ عام طور سے فکشن کی تنقید سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو میں فکشن کی تنقید لکھی ہی نہیں گئی۔

● دیکھیے صاحب! برا نہ مانیے گا۔ فکشن جسے کہتے ہیں وہ خود اردو میں ایک نئی چیز ہے اس لیے اس کی تنقید بھی نئی ہے۔ شاعری کی تنقید سے اس کا تقابل قبل از وقت ہے، پھر بھی یہ صحیح ہے کہ آج فکشن کے نقاد کھل کر بات نہیں کرنا چاہتے۔ ڈھیر ساری تھیوریز کے حوالے دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں کچھ باتیں ہوتی تھیں، فہرست سازی بھی ہوتی تھی۔ بہار میں 50اور 60 کے درمیان جو لوگ آئے ان پر کسی نے بھرپور طریقے سے نہیں لکھا۔ عام طور پر نقاد فکشن کو نظرانداز کرتے رہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فکشن کو دل جمعی کے ساتھ پہلے پڑھا جائے، تب لکھنے کا راستہ ملے گا۔ آج تو لوگ پڑھنا ہی نہیں چاہتے۔ شعر پڑھنے اور فکشن پڑھنے میں بہت فرق ہے۔

● اب اخیر میں صرف ایک سوال کے جواب کی زحمت دینا چاہتا ہوں کہ تمام نامساعد حالات کے باوجود کیا نئی نسل کے نقادوں میں آپ امکانات محسوس کرتے ہیں؟

● دیکھیے جناب! نہ میں زبان و ادب سے مایوس ہوں اور نہ کسی کو لعن طعن کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آنے والے وقتوں میں ہمارے نئے لوگ، ہمارے نئے نقاد بہتر طور پر ادب کی افہام و تفہیم کی راہ روشن کریں گے۔ بہت سے نئے لوگوں کی تحریروں سے میں یہ امیدیں رکھتا ہوں۔ ان لوگوں کے یہاں امکانات ہیں لیکن انھیں عصبیت اور تحفظات سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہوگا۔ گروپ بندی اور گروہ سازی سے الگ اپنی دنیا پیدا کرنی ہوگی۔ تبھی بات بنے گی۔

● آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ناسازیِ طبع کے باوجود اپنا قیمتی وقت دیا اور اپنے خیالات سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔

● میں بھی آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے جیسے کم تر ادیب کے لیے دو دنوں تک خود کو مصروف رکھا۔ شکریہ

□□□

2, Ehsan Manzil, Near Makhania Kuan Masjid,
Patna-800004

آغا جمیل کاشمیری/ یعقوب یاور (ہماری مطبوعات سے)

کلیاتِ آغا حشر کاشمیری

(دیباچہ)

ڈرامے کا تعلق تمثیل اور نقالی سے ہے، یہی سبب ہے کہ اس کے ابتدائی نمونے ان علاقوں میں ملتے ہیں جہاں بت پرستی عام تھی۔ ہندوستان اور یونان ایسے ہی خطے ہیں لیکن ان دونوں علاقوں میں ڈرامے کی روایت انفرادی طور پر پروان چڑھی۔ آگے چل کر جب دونوں میں تہذیبی روابط استوار ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ ہندوستان میں کالی داس کے ڈراموں کی فکری وفنی بلندی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ایک صدی قبل مسیح سے کافی پہلے ہوئی ہوگی۔ رفتہ رفتہ مختلف ناٹک منڈلیاں وجود میں آئیں جنھوں نے اس کی شکل ایسی بدلی کہ اس کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے رہ گیا۔

مسلمان ہندوستان آئے تو ان کا سابقہ ڈرامے کی اسی شکل سے پڑا۔ اول تو ان کا عقیدہ ایسی چیزوں کی سرپرستی کی اجازت نہیں دیتا تھا دوسرے اس عہد میں ڈرامے شرفا کے معیار پسند سے نیچے کی چیز ہو گئے تھے اس لیے اس فن کی خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی۔ البتہ شاہان اودھ کے آخری دور میں اس جانب توجہ دی گئی اور یہی اردو ڈرامے کے آغاز کا زمانہ ہے، جب سید آغا حسن امانت لکھنوی نے اندر سبھا کی تخلیق کی جسے اسٹیج پر بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس عہد میں امانت کی نقل میں متعدد اندر سبھائیں لکھی گئی۔ حتیٰ کہ یہ لفظ ڈرامے کے متبادل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ یہ اندر سبھائیں ملک کے مختلف حصوں میں اسٹیج کی گئیں۔

اسی زمانے میں عروس البلاد ممبئی میں بھی اردو ڈراموں کی جانب لوگوں کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ یہاں کی روایت کا سلسلہ اودھ کے بجائے انگریزی اور مراٹھی اسٹیج سے جڑا ہوا تھا۔ لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی نے اسے ایک منافع بخش کاروبار کی شکل دے دی تھی۔ کاروباری مسابقت نے اسے پھلنے، پھولنے اور نکھرنے کے وافر مواقع فراہم کیے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اردو ڈراموں کے افق پر آغا حشر کاشمیری نمودار ہوئے۔

آغا حشر کی پیدائش بنارس میں 4/3 اپریل 1879 کی درمیانی شب میں ہوئی۔ ان کے اجداد کا تعلق ان کے والد آغا غنی شاہ تک کشمیر سے قائم رہا، لیکن خود آغا حشر کا راست تعلق کشمیر سے نہیں تھا۔ والدین نے ان کا نام آغا محمد شاہ رکھا لیکن بعد میں انھیں شہرت آغا حشر کاشمیری کے نام سے ملی۔

جیسا کہ ان دنوں شرفا کے گھروں میں رواج تھا، آغا حشر کو عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم مولوی حافظ عبدالصمد نے دی جو اس زمانے کے مشہور معلم تھے۔ آغا صاحب کے والد انھیں عالم دین بنانا چاہتے تھے لیکن خود آغا حشر کو انگریزی تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ خاندان کے بعض افراد کے اصرار پر ان کا داخلہ جے نرائن اسکول میں کرا دیا گیا، جہاں انھوں نے درجہ چھ تک تعلیم حاصل کی۔ جب تک وہ اس اسکول میں زیر تعلیم رہے، اپنی ذہانت سے اپنے اساتذہ کا دل جیتتے رہے۔ اسی زمانے میں انھیں شاعری کا شوق ہوا اور وہ فارسی اور اردو میں شعر کہنے لگے۔

زمانۂ طالب علمی میں ہی آغا حشر کو ڈرامے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اپنے ہم جماعتوں کو ساتھ لے کر اسکول سے متصل قبرستان میں چادریں تان کر اندر سبھا اسٹیج کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں جبلی تھیٹریکل کمپنی بنارس آئی۔ طالب علموں کو رعایتی داموں پر ٹکٹ فراہم کرنے سے انکار پر آغا حشر نے "رفیع الاخبار" میں اس کمپنی کے ڈراموں پر شدید نکتہ چینی کی۔ کمپنی کی طرف سے اس کا جواب شائع ہوا تو آغا حشر نے اور شدت سے حملہ کیا۔ اس اخبار بازی سے بچنے کے لیے کمپنی کے مالکوں نے حشر کو مفت ڈراما دیکھنے کی دعوت دے کر مصالحت کر لی، اس طرح نہ صرف آغا حشر کو ڈراما دیکھنے کا موقع ملنے لگا بلکہ کمپنی کے ڈائرکٹر امرت لال اور ڈراما نویس مہدی حسن احسن لکھنوی سے بھی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دن کسی بات پر احسن صاحب سے بحث ہو گئی جس کے دوران حشر نے ان سے کہہ دیا کہ جیسا ڈراما آپ لکھتے ہیں، میں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہوں۔ احسن صاحب جیسے پختہ کار کے سامنے ایک نوجوان کا یہ دعویٰ تعلّی کے مترادف تھا تاہم اسے نبھانے کے لیے آغا حشر نے نہ صرف ڈراما "آفتاب محبت" لکھا بلکہ دوستوں کا ایک کلب بنا کر اسے اسٹیج بھی کر دکھایا۔ یہی آغا حشر کا پہلا ڈراما ہے جو 1897

"کلیات آغا حشر کاشمیری" (جلد چہارم) سے ماخوذ، مرتبین: آغا جمیل کاشمیری، یعقوب یاور/ صفحات 349، قیمت: -/137 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

میں جواہر اکسیر پریس، بنارس میں چھپ کر شائع ہوا۔

ایک طرف آغا حشر کی دلچسپیوں کا یہ حال تھا، دوسری طرف ان کے والد آبائی کاروبار میں ان کی دلچسپی نہ دیکھ کر ان کے مستقبل کی طرف سے فکرمند تھے۔ چنانچہ کافی غور وفکر کے بعد انھوں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے بنارس میں میونسپل بورڈ میں ان کے لیے ایک معقول ملازمت کا انتظام کردیا۔ اس ملازمت کے لیے کچھ زرِ ضمانت مطلوب تھا۔ آغا غنی شاہ بیٹے کو ساتھ لے کر میونسپلٹی گئے لیکن کسی ضروری کام کی وجہ سے مطلوبہ رقم آغا حشر کے حوالے کرکے گھر چلے آئے۔ اتفاقاً کوئی ایسی صورت پیش آئی کہ یہ رقم اس دن میونسپلٹی کے خزانے میں جمع نہ ہوسکی۔ جب آغا حشر گھر لوٹ رہے تھے تو راستے میں انھیں کچھ دوست مل گئے جن کی خاطر مدارات میں اچھی خاصی رقم خرچ ہوگئی۔ اس کے بعد والد کی جواب طلبی کے خوف سے ان کا رخ گھر کے بجائے اسٹیشن کی جانب مڑ گیا اور وہ ممبئی جا پہنچے۔

ممبئی آغا حشر کے لیے نئی جگہ تھی۔ ان کے علم میں تھا کہ ان کے ایک دوست عبداللہ ممبئی میں رہتے ہیں، وہ انھی کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ عبداللہ شاعری کے دلدادہ تھے۔ اتفاق سے اسی دن ممبئی میں کوئی مشاعرہ تھا۔ وہ آغا حشر کو لے کر اس میں شریک ہوئے۔ یہاں کسی بات پر ''ممبئی پنچ'' کے ایڈیٹر مولوی فرخ سے ان کی جھڑپ ہوگئی اور یہ جھگڑا ''ممبئی پنچ'' کے صفحات تک آ گیا۔ اس طرح آغا حشر شہر کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوگئے۔

کچھ دنوں بعد اپنے ایک دوست کے اصرار پر وہ الفریڈ کمپنی کے مالک کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ سے ملے۔ کاؤس جی اس وقت چائے پی رہے تھے۔ حشر نے ان کے حسبِ فرمائش چائے پر ایک فی البدیہہ نظم کہہ کر سنائی۔ اس کے بعد انھوں نے حشر کو دوسرے دن ملنے کے لیے کہا۔ حشر یہ سمجھے کہ کاؤس جی نے انھیں بڑے سلیقے کے ساتھ ٹال دیا ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد جب وہ کاؤس جی سے ملے تو انھیں الفریڈ کمپنی میں ڈراما نویس کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا اور 35 روپے ماہانہ مشاہرہ طے ہوا۔ اس کمپنی کے لیے انھوں نے سب سے پہلے ''مریدِ شک'' (1899) لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد ''مارِ آستین'' (1899) تصنیف کیا۔ اس ڈرامے کو بھی اسٹیج پر غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

حشر کی مقبولیت بڑھی تو مختلف ڈراما کمپنیوں کی طرف سے انھیں ملازمت کی پیش کش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر نو روز جی پری کی کمپنی کی ملازمت قبول کرلی۔ یہاں انھوں نے ''اسیرِ حرص'' (1901) لکھا۔ یہ ڈراما بھی بے حد پسند کیا گیا۔ حشر کی اس روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر کاؤس جی کھٹاؤ نے انھیں دوبارہ ساڑھے تین سو روپے ماہانہ پر اپنے یہاں بلا لیا۔ اس بار ان کی کمپنی کے لیے انھوں نے ''شہیدِ ناز'' (1902) لکھا جو حسبِ روایت کافی مقبول ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اڈیسر بھائی ٹھونٹھی کی کمپنی کے لیے 1906 میں ''سفید خون'' اور 1907 میں ''صیدِ ہوس'' اور سہراب جی اُگرا کی کمپنی کے لیے 1908 میں ''خوابِ ہستی'' اور 1909 میں ''خوبصورت بلا'' ڈرامے لکھے جنھیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈراما نویس کے طور پر بے حد مقبول ہونے کے باوجود آغا حشر اپنی موجودہ حیثیت سے ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ انھیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ مالکانِ کمپنی ان کی تحریروں میں اپنی صوابدید کے مطابق تحریف اور کاٹ چھانٹ کردیتے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک تعلقہ دار کے اشتراک سے 1909 میں انھوں نے دی گریٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے سہراب جی اگرا کی کمپنی کے لیے لکھا گیا ڈراما ''خوبصورت بلا'' اسٹیج کیا۔ اس کے بعد اگلے سال 1910 میں اپنا پہلا مجلسی ڈراما ''سلور کنگ'' عرف نیک پروین، لکھ کر پیش کیا۔ اسی سال ''یہودی کی لڑکی'' عرف مشرقی حور، بھی اس کمپنی کے اسٹیج پر دکھایا گیا۔ حیدرآباد میں مقبولیت کے ڈنکے بجانے کے بعد یہ کمپنی سورت ہوتی ہوئی ممبئی پہنچی اور یہیں ختم ہوگئی۔ اس کے بعد آغا حشر نے 1912 میں جالندھر کے بھائی گیان سنگھ کی نوتشکیل کمپنی میں پانچ سو روپے ماہوار پر ڈراما نویس کی حیثیت سے ملازمت کرلی، لیکن جلد ہی امرتسر میں یہ کمپنی بھی بند ہوگئی۔

1913 میں آغا حشر نے اپنے ڈراموں کی اداکارہ حور بانو سے لاہور میں شادی کرلی۔ اسی زمانے میں انھیں دہلی میں ایک عوامی استقبالیہ دیا گیا جس میں انھیں ''انڈین شیکسپیئر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ لاہور پہنچ کر انھوں نے اپنی دوسری کمپنی انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ یہ کمپنی مختلف شہروں کا دورہ کرتی ہوئی کلکتہ پہنچی۔ یہاں آغا حشر ریلوے پلیٹ فارم سے نیچے گر گئے جس کے نتیجے میں ان کے دائیں پیر کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چنانچہ انھیں کافی عرصے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسی علالت کے دوران انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا پہلا ہندی ڈراما ''بھگت سورداس'' عرف بلوا منگل، (1914) لکھوایا جو ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کی ہدایت میں پہلی بار اسٹیج ہوا۔ اس کے بعد کمپنی کھڑگ پور، مظفر پور اور پٹنہ ہوتی ہوئی بنارس آئی۔ قیامِ بنارس کے دوران آغا حشر کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جو صرف تین ماہ زندہ رہ کر لکھنؤ میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ کمپنی یوپی اور پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی لاہور ہوتے ہوئے سیالکوٹ پہنچی۔ یہاں آغا حشر اپنی زندگی کے ایک اور بڑے حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان کی اہلیہ جن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی ایک طویل علالت کے بعد 1918 میں لاہور میں انتقال کرگئیں۔ شریک حیات کی

اس مفارقت نے آغا صاحب پر کچھ ایسے نفسیاتی اثرات مرتب کیے کہ وہ کمپنی کا سارا سامان سیالکوٹ میں چھوڑ کر بنارس چلے آئے اور بہت دنوں تک یہیں آرام کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ رستم جی کی دعوت پر کلکتے گئے اور جے ایف میڈن کمپنی میں ایک ہزار روپئے ماہانہ پر ملازم ہوگئے۔ اس کمپنی کے لیے انھوں نے "مشرقی ستارہ" عرف شیر کی گرج، لکھا (1918) چونکہ کلکتے کے مارواڑی عوام ہندی ڈراموں کے شوقین تھے، اس لیے آغا حشر نے اس زمانے میں بطور خاص ہندی میں لکھنا شروع کیا اور "مدھر مرلی" (1919)، "بھارت رمنی" (1920)، "بھگیرتھ گنگا" (1920)، "ابھم پراچین" اور "نوین بھارت" (1921)، جیسے ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد اردو میں "ترکی حور" (1922) اور ہندی میں "سنسار چکر" عرف پہلا پیار، (1922) لکھا۔ اسی زمانے میں کلکتہ کی اسٹار تھیٹریکل کمپنی کے لیے انھوں نے بنگلہ زبان میں "اپرادھی کے" (1922) اور "مصر کماری" (1922) بھی لکھے۔ اسی کے ساتھ (1919) اور 1923 کے درمیان انھوں نے میڈن کمپنی کی خاموش فلموں میں اپنی اداکاری کے فن کا بھی مظاہرہ کیا۔ میڈن کے لیے انھوں نے "ترکی حور" اور "سنسار چکر" عرف پہلا پیار، کے بعد "بھیشم پرتگیا" (1923) اور "آنکھ کا نشہ" (1924) لکھے جنھیں زبردست عوامی مقبولیت ملی۔

شہرت اور مقبولیت کی اس بلندی پر پہنچنے کے بعد آغا حشر کے دل میں ایک بار پھر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی کمپنی قائم کریں۔ چنانچہ 1925 میں بنارس میں دی گریٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ کی بنیاد پڑی۔ اسے لے کر آغا حشر دورے پر نکلے۔ یہ کمپنی جب بہار اور یوپی کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی الہٰ آباد پہنچی تو مہاراجہ چرکھاری نے جو ان دنوں الہٰ آباد آئے ہوئے تھے آغا حشر سے "سیتا بن واس" کے موضوع پر ہندی میں ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ آغا حشر نے وعدہ کرلیا اور بنارس آکر اس ڈرامے کی تکمیل کی (1928)، یہ ڈراما مہاراجہ کو بے حد پسند آیا چنانچہ انھوں نے اسے آٹھ ہزار روپئے میں خرید لیا اور آغا صاحب کو مع اپنی کمپنی کے چرکھاری آنے کی دعوت دی۔ وہاں انھوں نے نہ صرف آغا حشر کی شاگردی اختیار کی بلکہ پچاس ہزار روپئے کی گراں قدر رقم کے عوض ان کی کمپنی بھی خرید لی اور آغا صاحب کو ہی اس کا نگراں مقرر کردیا۔ یہاں "سیتا بن واس" کا پہلا دیوناگری ایڈیشن جس کی تعداد اشاعت صرف دو جلد تھی (ایک آغا حشر کے لیے اور ایک مہاراجہ چرکھاری کے لیے) ولسن پریس چرکھاری سے مئی 1929 میں شائع ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کسی بات پر خوش ہوکر مہاراجہ نے کمپنی آغا حشر کو واپس لوٹا دی اور وہیں سے یہ معمول کے دورے پر کانپور کے لیے روانہ ہوگئی۔

اسی درمیان میڈن تھیٹرز لمیٹڈ نے آغا صاحب کو کلکتہ بلایا۔ چنانچہ وہ کمپنی کو آغا محمود شاہ کے حوالے کرکے کانپور ہی سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں رہ کر انھوں نے میڈن کی ممبئی شاخ دی امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف بامبے کے لیے اردو میں "رستم سہراب" (1929) لکھا جو اسی سال اسٹیج کیا گیا۔ اس کے علاوہ کلکتے میں قیام کے اس زمانے میں انھوں نے میڈن کے لیے ہندی کے تین ڈرامے "دھرتی بالک" عرف غریب کی دنیا (1929)، "بھارتی بالک" عرف سماج کا شکار (1930) اور "دل کی پیاس" (1931) لکھے جو ہندی ڈرامے کی روایت میں ایک گراں قدر بلکہ انقلاب آفریں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آغا حشر نے 1931 میں میڈن کی ملازمت چھوڑ دی اور بنارس آگئے۔ یہاں ان کے پیر میں چوٹ آگئی۔ دیسی دواؤں سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو وہ علاج کی غرض سے کلکتہ پہنچے۔ اس درمیان وہ اور بھی کئی امراض میں مبتلا ہوگئے تھے چنانچہ ماہر امراض قلب ڈاکٹر سنیل بوس کا علاج شروع ہوا۔ یہ دور سخت پرہیز کا تھا۔ ان دنوں کلکتے میں بولتی فلموں کا رواج بڑھ رہا تھا۔ میڈن تھیٹرز کے منیجنگ ڈائرکٹر فرام جی نے جو پائنیر فلم کمپنی کے مالک بھی تھے، آغا حشر سے فلمی ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ آغا صاحب نے ان کے لیے "شیریں فرہاد" لکھا جس میں ماسٹر نثار اور مس کجن نے بنیادی کردار ادا کیے۔ اس فلم کی مقبولیت نے دوسری فلم کمپنیوں کو آغا حشر کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ چاروں طرف سے فرمائشوں کی یلغار ہونے لگی جن کی تعمیل میں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے فلمی ڈراما "عورت کا پیار" لکھا جو کافی مقبول ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے فرام جی کے لیے مزید دو ڈرامے "دل کی آگ" (1931) اور "شہید فرض" (1931) لکھے جو مختلف وجوہ سے فلمائے نہیں جاسکے۔ ان کے علاوہ نیو تھیٹرز کے لیے "یہودی کی لڑکی" اور "چندی داس" ڈرامے لکھے ان پر تیار شدہ فلمیں کافی مقبول ہوئیں۔ اسی دوران میڈن نے "بھگت سورداس" (1914)، "شرون کمار" (1931) اور "آنکھ کا نشہ" (1924) پر ہندی میں اور "ترکی حور" (1922) اور "قسمت کا شکار" پر اردو میں فلمیں بنائیں جنھیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

آغا حشر کی بیماری کا سلسلہ دھیرے دھیرے طول پکڑتا جارہا تھا لیکن وہ حوصلہ ہارنے والے شخص نہ تھے۔ اسی عالم میں انھوں نے 1934 میں اپنی فلم کمپنی بنائی اور "رستم وسہراب" کو فلمانے کا ارادہ کیا۔ کرداروں کا انتخاب ہونے کے بعد ریہرسل ہورہی تھی کہ ایک مقدمے کے سلسلے میں انھیں لاہور جانا پڑا۔ یہاں انھوں نے اپنے دوست حکیم فقیر محمد چشتی کا علاج شروع کیا اور یہیں چند دوستوں کے مشورے پر حشر پکچرز کی بنیاد ڈال کر "بھیشم پتامہ" کی شوٹنگ شروع کردی۔ اس سلسلے میں انھیں کئی بار جموں اور سری نگر کا سفر بھی کرنا پڑا۔ اس مسلسل تگ ودو نے ان کی صحت پر مزید برا اثر ڈالا اور مصروفیات کے

سبب حکیم صاحب کا علاج بھی باقاعدگی سے جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ اسی بیماری میں 28 اپریل 1935 کو شام کے چھ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ حکیم فقیر محمد چشتی نے آغا محمود شاہ کو کلکتے فون کرکے ان سے لاہور ہی میں تدفین کی اجازت لے لی اور آغا صاحب مرحوم کی وصیت کے مطابق اگلے دن یعنی 29 اپریل کو دن میں میانی صاحب کے قبرستان چار برجی میں انھیں ان کی اہلیہ کے پہلو میں سپرد خاک کردیا گیا۔

اس کلیات میں شامل ڈراموں کے مطالعے سے پہلے مندرجۂ ذیل بنیادی باتوں کا جان لینا ضروری ہے تاکہ دوران مطالعہ پیدا ہونے والے سوالات کا تشفی بخش جواب مل سکے۔

"مارآستین" (1899) آغا حشر کا واحد ڈراما ہے جسے بہ ظاہر انھوں نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنا کوئی ڈراما اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ برجستہ مکالمات بولتے جاتے تھے اور بہ یک وقت کئی منشی انھیں قلم بند کرتے رہتے تھے۔ منشیوں کے لکھے ہوئے ان مسودوں کو وہ شاید ہمیشہ دیکھتے بھی نہیں تھے اور ان منشیوں کی اردو بس واجبی سی تھی اور املا ناقص۔ چنانچہ ان مسودوں میں جگہ جگہ املا کی غلطیاں موجود ہیں، جنھیں مرتبین نے درست کیا ہے۔ آغا حشر کی نظر میں ان مسودوں کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ حکومت کی طرف سے سنسر کے لیے مقرر حاکم مجاز کہانی کو سمجھ لے کہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اور کردار ادا کرنے والے ایکٹر ان کی مدد سے اپنے مکالمے یاد کرلیں۔ انھوں نے ان مسودوں کی تیاری کے دوران کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ ان کا استعمال انھیں شائع کرنے کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے۔

آغا حشر چونکہ اپنے بیش تر ڈراموں کے ہدایت کار بھی خود ہی ہوتے تھے اس لیے اکثر حالات میں انھیں مسودوں میں ہدایات اور مناظر کی تفصیل تحریر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ جن ڈراموں میں ہدایات موجود نہ تھیں، ان میں مرتبین نے ان کا اضافہ کیا ہے۔ جہاں ایسا کیا گیا ہے، اس کی نشان دہی کردی گئی ہے۔

آغا حشر کے ایک ہی ڈرامے کے ایک سے زائد مسودے موجود ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی بھی شہر یا ریاست میں ڈراما اسٹیج کرنے سے پہلے اس شہر یا ریاست کے حاکم مجاز سے اسے سنسر کرانا ضروری ہوتا تھا۔ اس غرض سے ہر بار ڈرامے کی نئی نقل تیار کرکے حکام کے سامنے پیش کی جاتی تھی جہاں سے مسودے پر checked and found nothing objectionable کا نوٹ لکھوا لینے کے بعد ہی اسے اسٹیج کیا جاسکتا تھا۔ بیش تر مسودوں پر یہ نوٹ موجود ہے۔

عوامی مقبولیت حاصل کرلینے والے کسی ڈرامے کے چند شو مکمل ہوجانے کے بعد اس میں نیاپن پیدا کرنے اور ناظرین کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی غرض سے اس میں کبھی بعض نئے مناظر جوڑ دیے جاتے تھے اور کبھی بعض مناظر نکال دیے جاتے تھے۔ ان مناظر کو ڈرامے سے نکال دینے کا سبب ان کی خامیاں یا کمزوریاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایسا محض تبدیلی یا نیاپن پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آغا حشر بھی یہ کام ڈراما کمپنیوں کے مالکان کی فرمائش پر کرتے تھے اور کبھی اپنے طور پر۔ اپنے طور پر عموماً اس وقت جب وہ خود ہی کمپنی کے مالک بھی ہوتے تھے۔

آغا حشر کا مرکز نگاہ (Target) وہ عام لوگ تھے جو اپنا پیسہ خرچ کرکے ان کے ڈرامے دیکھنے آتے تھے، وہ نہیں جو ادب کو فن لطیف کی حیثیت سے قبول کرکے اپنے اپنے گھروں میں اس کا لطف لینے کے عادی تھے۔ ڈراموں کی تخلیق کے دوران ادب ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے ان کی پوری توجہ ڈرامے کو دیکھے جانے اور ان ناخواندہ اور کم سواد ناظرین کے نقطۂ نظر سے پسندیدہ اور دلچسپ بنانے پر صرف ہوتی تھی، جن کے لیے یہ ایک سہل الحصول اور سستا وسیلۂ تفریح تھا۔ شعروسخن کے شائقین اور ادب کے سنجیدہ قارئین کی خاطر اس کی نوک پلک سنوارنے سے انھیں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ تھیٹر دیکھنے آنے والوں کی اکثریت پہلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور انھی کی پسند پر مالی اعتبار سے کسی ڈرامے کی کامیابی کا دارومدار ہوتا تھا۔ ناقدین کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ ڈراموں میں اپنی بھرپور ادبی صلاحیت کا استعمال نہیں کرسکے۔

اکثر ایک ہی ڈرامے کے دو مسودوں میں کرداروں کے نام بدلے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات کرداروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ مقامات کے نام بھی تبدیل کردیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "آنکھ کا نشہ" (1924) کے ایک مسودے میں کردار کالی داس، گوری ناتھ، سوہن اور کامنی ہیں۔ اس کا پس منظر بنارس ہے۔ جب کہ اسی ڈرامے کے ایک دوسرے مسودے میں کرداروں کے نام جگل کشور، بینی پرساد، مادھو اور کام لتا ہیں اور اس کا پس منظر کلکتہ ہے۔ ان صورتوں میں مرتبین نے بعد میں لکھے جانے والے مسودوں کو بنیاد بنایا ہے۔

ایک ڈرامے کے ایک سے زائد ناموں سے موسوم ہونے کا سبب یہ ہے کہ آغا حشر ڈرامے میں معمولی تبدیلیاں پیدا کرکے عوام کو باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ ڈراما اس ڈرامے سے مختلف ہے جو وہ پہلے کسی اور نام سے دیکھ چکے ہیں، تاکہ وہ لوگ بھی اسے دوبارہ دیکھنے آئیں جو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس طرح کی تبدیلی صرف آغا حشر نے نہیں کی ہے بلکہ اس عہد کی تمام ڈراما کمپنیاں یہی کرتی تھیں۔

آغا حشر کی ہندی اپنے معاصر اردو فن کاروں کے مقابلے میں کافی بہتر

تھی لیکن اردو ان کی فطری اور مادری زبان تھی۔ چنانچہ ان کے ہندی ڈراموں کو پڑھتے وقت بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہندی میں مکالمے لکھواتے لکھواتے یک بہ یک اردو بولنے لگتے تھے۔ پھر جیسے ہی انھیں خیال آتا تھا کہ جو ڈراما لکھوایا جارہا ہے وہ اردو میں نہیں ہندی میں ہے تو وہ پھر ہندی کی طرف آجاتے تھے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ وہ مکمل ڈراما پہلے اردو میں لکھاتے رہے ہوں گے اور بعد میں اس کا ہندی میں ترجمہ کرتے ہوں گے۔ اس کا امکان کم ہے کیوں کہ ایسا ہوتا تو بے خیالی میں جہاں وہ فارسی آمیز اردو لکھوا گئے ہیں اسے درست ہوجانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے غالب امکان اسی بات کا ہے کہ وہ فی البدیہہ اور براہ راست ہندی میں ہی ڈراما لکھواتے تھے۔ یہ بات تو اب سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ڈرامے ٹہل ٹہل کر منشیوں کو لکھوایا کرتے تھے۔

آغا حشر کے ڈرامے بلا اجازت چھاپنے والے پبلشروں نے ان ڈراموں کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ جو مکالمے یا حصے ان کی سمجھ میں نہیں آئے، ان کو اپنی طرف سے لکھ دیا ہے بلکہ اکثر ان کے ہندی ڈراموں کو کسی ہندی جاننے والے سے مشکل اور سنسکرت آمیز ہندی میں منتقل کروا کر چھاپا ہے۔ اس تعلق سے بنارس کے ٹھاکر پرساد اینڈ سنز کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو آغا حشر کی ناک کے نیچے یہ کام دھڑلے سے کر رہے تھے۔ آغا حشر نے ذاتی طور پر کبھی اس جانب توجہ نہیں دی۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آغا حشر کے جعلی ایڈیشن چھاپنے والے پبلشرز اپنے منشیوں کو آغا حشر کے لکھے ڈرامے دیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، جہاں سے وہ اس کے مکالمات نوٹ کرلاتے تھے۔ یہ کام ایک ساتھ ایک سے زائد منشیوں سے کروایا جاتا تھا۔ بعد میں ان کی تحریروں کو ترتیب دے کر اور جو حصے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے ان میں حسب ضرورت اصلاح کرکے یا انھیں اپنی طرف سے ازسر نو لکھ کر ڈراما شائع کردیا جاتا تھا۔ اصلاح و ترمیم کا یہ کام عموماً وہی منشی انجام دیتے تھے جنھیں نمائش کے دوران ان ڈراموں کی نقل کے کام پر مامور کیا جاتا تھا۔

آغا حشر نے اپنے ہندی ڈراموں کے لیے جو گانے لکھے ہیں ان میں بیش تر فارسی وزن اور بحروں کا استعمال کیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں انھوں نے لوک گیتوں، دوہوں یا موسیقی کی لوک دھنوں کو اپنایا ہے وہاں فطری طور پر عروضی ڈھانچہ بھی ہندوستانی ہوگیا ہے۔ انھوں نے بعض ہندی الفاظ کو ان کے رائج عوامی تلفظ کے مطابق استعمال کیا ہے۔

یہ معاصر ماحول میں رچی بسی انگریزی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے یا پھر شعوری طور پر ایسا کیا گیا ہے کہ عمومی بات چیت کے مکالموں میں آغا حشر نے حال استمراری (Present Imperfect) کی بجائے حال قریب (Present Indefinite) کا استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اردو میں انگریزی کے اس صیغے (Tense) کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ اردو میں عام طور پر "وہ جاتا ہے" کے بدلے "وہ جارہا ہے" کا پیرایۂ بیان زیادہ مقبول ہے۔ اور جب "وہ جاتا ہے" کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے عادت کے اظہار کا کام لیا جاتا ہے۔ یعنی ایسی جگہوں پر اس کا مفہوم "وہ جایا کرتا ہے" ہوجاتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ آغا حشر نے ڈرامے میں ایک مصنوعی فضا قائم کرنے کے لیے یہ انداز بیان اختیار کیا ہو۔

آغا حشر نے اردو ڈرامے کو کیا دیا اس کا تجزیہ خاطر خواہ طریقے سے نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے ڈراموں کی اشاعت یا مسودوں کے تحفظ میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اسٹیج کے عاشق تھے اور ہر ڈرامے کو اسٹیج تک پہنچا کر مطمئن ہوجاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بازاری و کاروباری نوعیت کی بعض غیر مصدقہ اشاعتوں سے قطع نظر یہ ڈرامے اپنی اصل شکل میں کبھی منظر عام پر نہیں آسکے۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی انھیں باضابطہ طور پر شائع کی ہے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ "اکیسویں صدی میں اردو ڈرامے کو آغا حشر کی دین" پر خاطر خواہ گفتگو ہوسکے گی۔

□□□

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں "پس نوشت: آج یہ کتاب" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

اردو خبر نامہ

ہندوستان کی آزادی اور تعمیر نو میں مولانا آزاد کا حصہ ناقابل فراموش — صدر جمہوریہ ہند

● نئی دہلی۔ 11 نومبر، تعلیم کو بنیادی حقوق میں شامل کرنے کا بل پارلیمنٹ کے آئندہ سرمائی اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ انسانی وسائل کے وزیر جناب ارجن سنگھ نے آج یہاں یہ اعلان کیا۔ یہ اعلان عظیم مجاہد آزادی اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد کے یوم پیدائش اور پہلا قومی یوم تعلیم منانے کی تقریب میں کیا گیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد صدر محترمہ پرتبھا پاٹل نے جو مہمان خصوصی تھیں، زور دے کر کہا کہ تعلیم سب کے لیے ہونی چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے ثمرات معاشرے کے کمزور طبقات تک پہنچ سکیں۔ انھوں نے کہا "میں اپنے اس خیال کو ایک مرتبہ پھر دہراتی ہوں کہ ملک کے ہر شہری کو، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی، تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔"

محترمہ پاٹل نے ہندوستان کے نظام تعلیم کو نئی شکل دینے کے لیے مولانا آزاد کے تدبر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ سمجھتی ہیں کہ تعلیم سماج میں تبدیلی لانے کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے کہا "آج کے دن کو، جب ہندوستان کا عظیم سپوت پیدا ہوا تھا بطور قومی یوم تعلیم منانا بہت مناسب ہے۔ یہ دن منانے کا مقصد ہمارے تعلیمی اداروں کو مضبوط کرنا اور تعلیم کے معیار کو بلند کرنا ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر ہمیں مولانا آزاد کی دین کو یاد کرنا چاہیے جنھوں نے آزاد ہندوستان کے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قوم کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تنگ نظری ہے اور یہ تعلیم سے ہی دور ہو سکتی ہے۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مولانا آزاد نے فرقہ واریت کے خلاف بہت سخت موقف اپنایا اور سیکولر ہندوستان کی وکالت کی۔ وہ مساوات کے حامی تھے اس وجہ سے وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے چہیتے بن گئے تھے جو انھیں میر کارواں کہا کرتے تھے۔ قبل ازیں انسانی وسائل کے وزیر جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ انھیں امید ہے کہ تعلیم کے حق کا بل پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں پیش کر دیا جائے گا جس سے مولانا آزاد کا یہ خواب پورا ہو سکے گا کہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ شناخت ہو۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اصلاح عمل کو معاشرتی ڈھانچے کی بنیادوں سے شروع کریں — نائب صدر جمہوریہ ہند

● علی گڑھ۔ 18 اکتوبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں طلبائے قدیم کے عالمی اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ہند جناب حامد انصاری نے کہا کہ دنیا بھر میں پھیلے سابق طلبہ کو یونیورسٹی کی جانب سے پیش کی گئیں عملی تجاویز کے ذریعے جو نیا رخ اپنانے کی کوشش کی گئی ہے اس میں مدد کرنی چاہیے۔ جناب حامد انصاری نے مزید کہا کہ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم عوامی بہبود کے لیے انسانی وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تعلیم نسواں پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمیں قومی سطح پر اس کے لیے تحریک چلانی چاہیے کیونکہ یہ موجودہ دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔ جناب حامد انصاری نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبائے قدیم سے کہا کہ وہ اس موقعے پر اپنا احتساب کریں کہ سرسید نے جس مشن کے تحت یہ ادارہ قائم کیا تھا ہم اس مشن کے تعلیمی فیوض ملک کے تمام طبقات تک پہنچا سکے یا نہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کے سابق طلبہ سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس سلسلے میں اجتہادی فکر پیدا کریں اور محض یاد ماضی کی ورق گردانی تک خود کو محدود نہ رکھیں۔ یونیورسٹی کی تجربہ گاہوں کی جدید کاری، نئے کورسیز کے آغاز، یونیورسٹی میں طلبہ کے لیے سہولیات میں اضافہ اور نئے رہائشی ہالوں کی تعمیر وغیرہ کے لیے ایک سو کروڑ روپے کے ایک فنڈ کی تشکیل دینے کے یونیورسٹی کے فیصلے کی تعریف کرتے ہوئے جناب حامد انصاری نے کہا کہ اے ایم یو انڈومنٹ فنڈ یونیورسٹی کی تعلیمی ترقی کے ایک نئے دور کا ضامن ہوگا۔ جناب حامد انصاری نے علی گڑھ برادری سے اپیل کی کہ وہ اصلاح کے عمل کو معاشرے کے ڈھانچے کی بنیادوں سے شروع کریں۔ اتر پردیش کے گورنر جناب ٹی وی راجیشور نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے جو تعلیمی تحریک شروع کی تھی اس کو آگے بڑھانے کے لیے اس ادارے کے طلبائے قدیم کو آگے آنا چاہیے اور یونیورسٹی کے ترقیاتی منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی مادر علمی کی ہر طرح سے معاونت کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سو کروڑ روپے کا جو کارپس فنڈ بنایا جا رہا ہے اس کے لیے وہ گورنر کی حیثیت سے ایک لاکھ روپے کی مالی مدد فراہم کرائیں گے۔ جھارکھنڈ کے گورنر سید سبط رضی نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمارا قومی اثاثہ ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی علامت

ہے۔ سرسید نے اس ادارے کو اس لیے قائم کیا تھا کہ یہ ادارہ مسلمانوں کو ایک سمت دے اور سب کو ساتھ لے کر چلے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقی کے نئے تناظر میں یہ ادارہ پھر سے اپنا رول ادا کرے اور نئے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالے۔ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر اور سابق چیف جسٹس آف انڈیا اے ایم احمدی نے اس موقع پر ایک یادگاری مجلے کا اجرا کرتے ہوئے اس کی پہلی کاپی ممتاز مورخ پدم بھوشن پروفیسر عرفان حبیب کو پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گہری عقیدت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی اس ادارے کا ایک سابق طالب علم تصور کرتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے دنیا بھر کے 20 ممالک سے آئے طلبائے قدیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے طلبائے قدیم اپنی مادر علمی سے گہری عقیدت اور جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس عالمی چوٹی کانفرنس کا بنیادی مقصد طلبائے قدیم کا اپنی مادر علمی کے ساتھ پرانے رشتوں کو پھر سے جوڑنا اور یونیورسٹی کی فلاح و بہبود، اس کی تعلیم و تحقیق کے میدان میں دنیا بھر میں پھیلے طلبائے قدیم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ اس موقعے پر اتر پردیش کے وزیر جے ویر سنگھ الیومنائی، میٹ کے نائب صدر اور سابق وائس چانسلر پروفیسر ایم سلیم الدین کے علاوہ سابق وزیر اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری نواب کوکب حمید، فیڈریشن آف علی گڑھ، الیومنائی ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر مسرت علی، میڈیسن (امریکا) کے ڈاکٹر مسعود، اٹلانٹا (امریکا) کے ڈاکٹر حسن کمال، سعودی عربیہ کے جناب ندیم ترین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی مادر علمی کی توسیع و ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر وی کے عبدالجلیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر جاوید اختر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

موجودہ سیاسی صورت حال میں ترقی پسندانہ اقدار کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے: اختر جاوید

● گیا، 18/ اکتوبر، 2008۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے دو روزہ سیمینار "جشن ادریس و مخدوم محی الدین" کا ریتا ساں آڈیٹوریم، گیا میں 17 اکتوبر کی شام کو افتتاح جناب شمیم فیضی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور پروفیسر لطف الرحمٰن نے اور نظامت جناب حسن نواب نے کی۔ اس اجلاس میں "ادریس سنسہاروی کے منتخب اداریے" کا اجرا جناب شمیم فیضی نے کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے مخدوم محی الدین سے اپنی اثر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جن شعرا سے فیض حاصل کیا ہے مخدوم ان میں سرفہرست ہیں۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ادب کا موازنہ دوسرے فنون لطیفہ اور سائنسی علوم سے کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ انسان کی حیوانی جبلتوں کو اگر کوئی مہذب بنا سکتا ہے تو وہ ادب ہے، سائنس خارجی زندگی کی وسعتوں کو روشن کرتا ہے لیکن انسان کی باطنی زندگی کی پہنائیوں کی سیر ادب سے ہی ممکن ہے۔ ادب انسان کی دانشورانہ میراث ہے اور یہ جغرافیہ، زبان اور تہذیب کی حدود سے بلند ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کالیداس بھی ہمارے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا شیکسپیئر یا فردوسی یا غالب اور اقبال۔ دوسرے علوم ہمیں آگہی دیتے ہیں جبکہ ادب خود آگہی دیتا ہے اس لیے ادب انسانیت کی میراث اور اس کی بقا کا ضامن ہے۔ چائے کے وقفے کے بعد پہلا اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر علیم اللہ حالی اور ڈاکٹر مسعود منظر نے کی اور نظامت جناب عاصم شہنواز شبلی نے۔ اس اجلاس کا پہلا پرچہ جناب جاوید رحمانی نے "کچھ جشن ادریس و مخدوم کے بارے میں" کے عنوان سے پیش کیا جس میں مخدوم محی الدین اور ادریس سنسہاروی کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ مخدوم ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے جبکہ ادریس سنسہاروی ایک کارکن کی۔ اس طرح ان دونوں کا جشن ایک ساتھ منا کر قومی کونسل نے ترقی پسندوں کی ایک مردہ سنت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ ترقی پسندی کے ابتدائی زمانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ ان میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ دوسرا مقالہ سید احمد قادری نے پڑھا جس میں ادریس سنسہاروی کے اداریوں میں موجود سماجی سروکاروں پر روشنی ڈالی گئی اور تیسرا مقالہ جناب شبر امام کا تھا جس میں ادریس سنسہاروی کے تعلق سے انھوں نے اپنی یادداشتوں کو پیش کیا۔

اس سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کا آغاز صبح 10 بجے ہوا جس کی صدارت جناب گلزار دہلوی، جناب تروینی سدھا کر شرما اور پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی اور نظامت کا فریضہ جناب جاوید رحمانی نے انجام دیا۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر شاہد ساز نے پیش کیا جس میں ماہنامہ سہیل کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا۔ دوسرا پرچہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے لیکچرر ڈاکٹر مشرف علی نے مخدوم محی الدین کی سیاسی سرگرمیوں اور ان کی انقلابی شاعری پر پیش کیا۔ تیسرا مقالہ جناب سید محسن رضا رضوی کا تھا۔ انھوں نے مخدوم کی شاعری کے امتیازات سے بحث کی۔ چوتھا

مقالہ ڈاکٹر شیریں زباں خانم نے پڑھا۔ انھوں نے مخدوم محی الدین کی نظم نگاری کے امتیازات پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کا آخری اور سب سے فکر انگیز مقالہ جناب شمیم فیضی کا تھا۔ انھوں نے "مخدوم کی داستانوی شخصیت اور اس کی معنویت" کے عنوان سے مخدوم محی الدین کی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیت کا بہت ہی عمدہ مطالعہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انھوں نے پہلے انگریزی میں لکھا تھا جس کا بعد میں اس سیمینار کے لیے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان تمام پرچوں کے حوالے سے صدارتی خطبہ جناب گلزار دہلوی نے دیا۔ انھوں نے مخدوم سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ مخدوم اچھے شاعر تو تھے ہی وہ بیحد باغ و بہار شخصیت کے بھی مالک تھے اور جس محفل میں موجود ہوتے اس محفل کی جان بن جاتے۔ ان کے بعد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے صدارتی خطبے میں تمام پرچوں پر اظہار خیال کیا اور شاعری میں فکر اور فن کے بارے میں مروجہ خیالات پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا کہ اچھی شاعری فکر و فن کے حسین امتزاج کا نام ہوتی ہے۔ ان کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اس دو روزہ سیمینار کی غرض و غایت پر اپنی صدارتی تقریر میں روشنی ڈالی اور ادب اور نعرے بازی کے تعلق سے اس اجلاس کے صدور کی تقاریر میں شامل بعض مفروضات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پروفیسر لطف الرحمٰن سے درخواست کی کہ وہ اپنی تقریر میں ان معاملات کو واضح کریں چنانچہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اس اجلاس کے مقالوں کا تفصیل سے جائزہ لیا اور بتایا کہ شعر و ادب کی حیثیت مصوری اور موسیقی سے کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ شعر و ادب انسانی اظہار کا سب سے موثر اور مضبوط وسیلہ ہے، دوسرے تمام فنون لطیفہ سے اس کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ کھانے کے وقفے کے بعد اس دو روزہ قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی بھی نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی اور صدارت ڈاکٹر علی جاوید (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نے اور ڈائس پر معزز مہمانان کی حیثیت سے ڈاکٹر ابو بکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل)، ڈاکٹر شیریں زباں خانم، جناب جمیل منظر اور جناب تروینی پرشاد سدھاکر موجود تھے۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے پڑھا جس میں ادریس سنسہاروی کے اداریوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا گیا۔ دوسرا مقالہ پروفیسر علیم اللہ حالی نے پیش کیا۔ انھوں نے بھی ماہنامہ "سہیل" کے اداریوں پر گفتگو کی۔ تیسرا مقالہ جناب سید رضا عباس رضوی نے پیش کیا جس کا عنوان تھا "مخدوم محی الدین ناقدین کی نظر میں"۔ اس کے بعد ان تینوں پرچوں پر گرما گرم بحث ہوئی اور قومی کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابو بکر عباد نے ان تینوں پرچوں کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی۔ ان کے بعد ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی کونسل نے اس دو روزہ سیمینار کی کامیابی کے لیے گیا شہر کے باشندوں کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس سے پہلے 1976 میں اسی شہر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قومی سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد قومی اردو کونسل نے اس شہر میں اردو کی دو ممتاز ترقی پسند شخصیتوں پر اس سیمینار کا انعقاد اس لیے کیا تاکہ ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ اس شہر میں پھر سے شروع ہو اور ہم امید کرتے ہیں کہ اس سیمینار کے بعد اس شہر میں اردو ادب اور زبان کے مسائل اور شخصیات پر ادبی جلسوں اور سیمیناروں کا سلسلہ ضرور شروع ہوگا۔ انھوں نے موجودہ سیاسی صورت حال میں ترقی پسندانہ اقدار کو پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور ناگزیر بتایا اور کہا کہ وہ زبان یا ادب جو سماجی مسائل سے بے نیاز ہو اس کا زندہ رہنا مشکل ہے کیوں کہ ادب بہر حال سماج میں پیدا ہوتا ہے اور سماج کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خلا میں پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ ان کی اس تقریر پر سامعین نے بڑے جوش و ولولے کے ساتھ داد دی۔ ان کے بعد جناب جمیل منظر نے سامعین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر علی جاوید کی رہنمائی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قومی اردو کونسل کو نئی وسعتوں اور بلندیوں پر پہنچایا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ کونسل ان کی رہنمائی میں آئندہ بھی اردو ادب کے نئے افق کی دریافت کا فریضہ انجام دیتی رہے گی اور یہ دو روزہ سیمینار کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

سرسید تقریبات

● میرٹھ۔ 17 اکتوبر، شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں ہر سال کی طرح امسال بھی 17-16 اکتوبر 2008 کو دو روزہ جشن سرسید کا اہتمام کیا گیا۔ پہلے دن یعنی 16 اکتوبر کو ایک تحریری مقابلے کا انعقاد بعنوان "تعلیمی بیداری میں سرسید احمد خاں کا کردار" کیا گیا جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں اور اس سے منسلک کالجوں سے بی۔اے اور ایم۔اے۔ اردو ہندی کے طلبہ و طالبات کافی تعداد میں شریک ہوئے۔ تحریری مقابلے میں اردو زبان کے زمرے میں کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات میں ثنا نسرین، نواب عظمت علی خاں گرلس کالج، مظفر نگر (اول) عبدالقادر، شعبۂ انگریزی، سی سی ایس یونیورسٹی میرٹھ (دوم)، عبدالرحمٰن، شعبۂ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی میرٹھ (سوم) اور خالدہ ابراہیم فیض عام ڈگری کالج، میرٹھ (حوصلہ افزائی ایوارڈ) کے نام ہیں۔ ہندی زبان کے زمرے میں کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات ترچنا سینی فیض عام ڈگری کالج، ترنم پروین (اول) نواب عظمت علی خاں گرلس ڈگری کالج (دوم) انجم پروین (سوم) سی سی ایس یونیورسٹی اور شاہ محمد قاسم میرٹھ کالج

میرٹھ (حوصلہ افزائی ایوارڈ) نے انعامات حاصل کیے۔ یہ انعامات ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر ارچنا شرما اور ڈاکٹر ارون کمار نے دیے۔

17 اکتوبر سرسید نیشنل ریسرچ اسکالر سیمینار بعنوان "سرسید احمد خاں: حیات اور خدمات" منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی گیارہ یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور سرسید پر اپنے مقالات پیش کیے۔ بالخصوص سرسید کی تعلیمی خدمات پر زور دیا گیا۔ پہلے اجلاس کی مجلس صدارت میں محترمہ نایاب زہرہ زیدی، جناب راجیو شرما اور جناب آفاق احمد خاں تھے جبکہ نظامت کا فریضہ محترمہ شاداب علیم نے انجام دیا۔ ڈاکٹر شہپر رسول اور ڈاکٹر محمد کاظم نے منصف کے فرائض انجام دیے۔ شکریے کی رسم شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر علاء الدین خاں نے ادا کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر یونس غازی اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نئی نسل کو سرسید، ابوالکلام آزاد اور دوسرے رہنماؤں کے کارناموں سے واقف کرائیں تاکہ وہ ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔ جشن سرسید ہم اس لیے نہیں مناتے کہ علیگ برادری کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور ڈنر کھائیں بلکہ ہمارا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ سرسید نے قوم کی، اردو زبان کی، ملک کی جس طرح جان و مال کے ساتھ خدمات کی وہ جذبہ ہمارے اندر بھی پیدا ہو۔ نظامت یونس جمشید نے کی۔ ان اجلاس میں 15 مقالے دہلی یونیورسٹی، الٰہ آباد یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، گورکھپور یونیورسٹی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کوٹہ یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز نے پیش کیے۔

تیسرے اجلاس میں تحریری مقابلہ، سیمینار اور اردو ٹیچنگ اور اردو کی خدمات کے لیے ایوارڈ دیے گئے۔ سرسید ایوارڈ برائے اردو ٹیچنگ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ڈاکٹر شہپر رسول اور میرٹھ کالج کے ڈاکٹر یونس غازی کو دیا گیا۔ سرسید ایوارڈ برائے اردو سروسیز مرزا منہاج الدین (Meerut B.T.) کو دیا گیا۔ پہلے دونوں سیشن میں عمدہ مقالے پیش کرنے والوں کو اول، دوم، سوم اور حوصلہ افزائی انعام دیے گئے امام الدین خاں، لکھنؤ یونیورسٹی (اول)، شبانہ پروین، بنارس ہندو یونیورسٹی (دوم)، محمد مصاحب علی، مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، (سوم) اور فرزانہ رحمان، دہلی یونیورسٹی، اور عبدالحی، الٰہ آباد یونیورسٹی نے (حوصلہ افزائی) انعام حاصل کیا۔

(ڈاک سے)

● علی گڑھ۔ 13 اکتوبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے زیر اہتمام میوز یولوجی شعبے کے تعاون سے منعقد نمائش "دہلی سرسید کی نظر سے" کا افتتاح آج میوزیولوجی شعبے کے میوزیم میں پروفیسر جاوید مسرت نے کیا۔ یہ نمائش جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ تاریخ وثقافت کے پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین اور محترمہ طیبہ منور نے لگائی ہے۔ پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے نمائش کے بارے میں بتایا کہ یہ نمائش سرسید احمد خاں کی مشہور کتاب "آثار الصنادید" پر منحصر ہے۔ انھوں نے بتایا کہ 1846 میں سرسید نے "آثار الصنادید" شائع کی تھی۔ انھیں دہلی کی عمارات سے بےحد محبت تھی اور انھوں نے دہلی کی تمام تاریخی عمارات پر کام کیا اور ان کی تصویریں بنائیں۔ کیونکہ یہ تصویریں رنگین تھیں اس لیے وہ اس وقت انھیں شائع نہیں کراسکے لیکن انھوں نے یہ تصاویر ایم اے او کالج کی لائبریری کو دے دیں جو آج بھی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر جاوید مسرت نے نمائش کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ نمائش ایسے وقت پر لگائی گئی ہے جب یونیورسٹی اپنے بانی کا 191 واں یوم پیدائش منارہی ہے اور یہاں دنیا کے بیس ممالک اور ملک بھر کے ابنائے قدیم کانفرنس میں شرکت کے لیے آرہے ہیں۔ اس نمائش میں چالیس تصاویر کی نمائش کی گئی ہے۔ ان میں قلعہ رائے پتھورا، قوت الاسلام مسجد، درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، قلعۂ عادل آباد، مدرسہ غازی الدین خاں، مقبرہ عبدالرحیم خان خاناں اور قلعۂ مبارک پور کی تصاویر شامل ہیں۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

● علی گڑھ۔ 23 اکتوبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طلبائے قدیم کی عالمی کانفرنس کے موقعے پر ادارے کی لائبریری میں سرسید کی کتب ورسائل کی ایک دن کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ ڈائرکٹر سرسید اکادمی پروفیسر شان محمد نے اس نمائش کا افتتاح کیا۔ اس نمائش میں سرسید کی مطبوعہ نوادرات میں "خطبات احمدیہ" کے اولین انگریزی و اردو ایڈیشن شامل تھے جو بالترتیب 1870 اور 1887 میں شائع ہوئے تھے۔ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی میں سیکڑوں کتب ورسائل اس نمائش میں قابل دید تھے۔ نمائش کے افتتاح کے موقعے پر پروفیسر شان محمد نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے زیراہتمام سرسید پر کتب و رسائل کی نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے توسط سے سرسید سے متعلق ادارۂ علوم اسلامیہ کی لائبریری کا بڑا قیمتی ذخیرہ طلبہ، اساتذہ اور محققین کے سامنے آگیا۔ صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر ظفر الاسلام نے کہا کہ سرسید پر ادارۂ علوم اسلامیہ کی لائبریری میں محفوظ قیمتی کتب ورسائل سے اہل علم کو متعارف کرانے کی یہ ایک ادنیٰ کوشش تھی جو شکر خدا کہ حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ انھوں نے لائبریری کی دیکھ ریکھ اور خاص طور سے اس نمائش کے اہتمام کے لیے اسسٹنٹ لائبریرین کبیر احمد خاں اور ان کے رفقا کی محنت اور لگن کو سراہا۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد صلاح الدین عمری، پروفیسر محمد رفیق، پروفیسر جاوید علی، پروفیسر عبدالعلی اور پروفیسر ٹیسین مظہر صدیقی کی موجودگی سے اس پروگرام کے وقار میں اضافہ ہوا۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 23 اکتوبر، ''سرسید احمد خاں کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کی اشاعت کے ایک سو پچاس سال پورے ہونے کے موقعے پر سرسید فاؤنڈیشن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعاون سے جامعہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں ایک جلسے کا انعقاد کیا، جس کی صدارت پروفیسر زویا حسن نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر جناب عبدالرشید شیروانی نے شرکت کی جبکہ پروفیسر افتخار عالم خاں نے سرسید کی تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' جو 1857 کی بغاوت کے موضوع پر کسی ہندوستانی کی سب سے پہلی تحریر ہے، پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر عزیزالدین حسین نے کہا کہ بی جے پی (یوپی) کے ترجمان بلوپریٹ نے سرسید کو انگریز پرست ٹھہرایا وہ یہ بھول گئے کہ سرسید نے اسمبلی کونسل (Legislative Council) میں ہندوستانیوں کی نمائندگی نہ ہونے کو 1857 کے غدر کا سبب بتایا۔ پروفیسر عرفان حبیب اور پروفیسر فرانسس روبنس نے بھی تاریخ کے حوالوں سے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر وی پی سنگھ تور نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ جبکہ مہمان خصوصی کا شکریہ خواجہ شاہد نے ادا کیا۔ انھوں نے سرسید فاؤنڈیشن کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● پورنیہ۔ 18 اکتوبر، سرسید احمد خاں کے یوم ولادت پر مقامی سرسید اکادمی میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر اکادمی کے پرنسپل ڈاکٹر کلیم اللہ نے سرسید کی ہمہ گیر علمی خدمات پر جامع تقریر کی اور کہا کہ ایسی عظیم شخصیتوں کے نقش قدم پر چل کر ہی کامیابی اور کامرانی کی منزل طے کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے بزرگوں کے کارناموں کو یاد کرتے رہنا چاہیے تاکہ اس سے ناموافق حالات میں بھی آگے بڑھنے کی تحریک ملتی رہے۔ اس موقعے پر اسکول کے بچوں نے خوبصورت نظمیں اور ترانے پیش کیے اور سرسید کی تعلیمی خدمات پر مختلف مقالے اور مضامین کے ساتھ تقریریں بھی پیش کی گئیں۔ سعید روشن، کنیز فاطمہ، منظر عالم، طلعت ناز، شگفتہ شاہین، شاہینہ شہناز، شگفتہ پروین اور خوشناز نے قومی گیت پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر کلیم اللہ کررہے تھے جبکہ نظامت کے فرائض مولانا شعیب عالم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر بطور مہمان پروفیسر شکیل احمد اور پروفیسر اعجاز احمد موجود تھے۔ ان دونوں حضرات نے بھی سرسید کی زندگی، ان کے کارناموں اور ان کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی اور بچوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مولانا آزاد تقریبات

● علی گڑھ۔ 11 نومبر، عظیم مجاہد آزادی، ممتاز ماہر تعلیم اور ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کے موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈینٹل کالج، ویمنس کالج اور ویمنس پالی ٹیکنک میں متعدد پروگرام منعقد کیے گئے۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنیک میں منعقد تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ مولانا آزاد کو اس ملک کی سرزمین اور اس کے عوام سے بے پناہ محبت تھی اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے نہ صرف ملک کی تقسیم کی مکمل کر مخالفت کی بلکہ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ لوگ پاکستان نہ جائیں۔

مسلم یونیورسٹی کی قانون فیکلٹی کے سینئر ریڈر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ مولانا آزاد نے اپنی تمام زندگی ہندو مسلم اتحاد کے لیے وقف کردی تھی جس کی اس ملک کو آج پھر سے ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے جس تعلیم کی بنیاد رکھی یہ ملک آج بھی اسی تعلیمی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ آج ملک سخت دور سے گزر رہا ہے اور ایسے حالات میں ملک کا استحکام تبھی ممکن ہے جب ملک سے نفرت کا ماحول ختم ہو اور لوگوں میں اتحاد قائم ہو جس کے مولانا آزاد ہمیشہ حامی رہے۔ شعبۂ سیاسیات میں ریڈر ڈاکٹر محب الحق نے آئندہ سال سے مولانا آزاد لائبریری میں مولانا آزاد کی حیات پر ان کی تصاویر اور کتابوں کی نمائش لگانے کا بھی مطالبہ کیا۔ پالی ٹیکنیک کے پرنسپل پروفیسر ایس اقبال علی نے کہا کہ حکومت ہند نے ان کے یوم پیدائش کو قومی یوم تعلیم کے طور پر منانے کا جو اعلان کیا ہے وہ ایک تاریخی اقدام ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہد نے کہا کہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو ہر سال یوم تعلیم کے طور پر منانے کا فیصلہ دیر آید درست آید والی کہاوت ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صابر علی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

ڈینٹل کالج میں منعقد تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر ایم سلیم الدین نے کہا کہ حالانکہ آزاد مذہبی ماحول میں پیدا ہوئے اور مذہبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی لیکن ان کی مذہبیت ان کی سیاست میں دخیل نہیں ہوئی جو آج کے سیاست دانوں کے لیے ایک سبق ہے۔ وہ بھی مذاہب سے محبت کرتے تھے۔ پروفیسر سلیم الدین نے کہا کہ طلبہ مولانا آزاد کی زندگی سے ترغیب حاصل کریں اور اپنے وقت کو صحیح استعمال کرکے عوامی فلاح کے کاموں کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کریں۔ ڈینٹل کالج کے پرنسپل پروفیسر ایس ایچ ہاشمی نے مولانا آزاد کے صحافت سے شغف کا ذکر کیا۔ ڈینٹل کالج کے طالب علم ساگر گرگ نے مولانا آزاد کی زندگی اور پرتوبی بھوشن نے ہندوستان میں تعلیم کی ترویج میں مولانا آزاد کے رول پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● رام پور۔ 11 نومبر، مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت پر محمد حسن صابری کی صدارت اور رضوان احمد صدیقی کی نظامت میں ہونے والے سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے شوکت علی خاں ایڈووکیٹ نے کہا کہ ہندوستانی

تاریخ میں حکیم اجمل خاں، مختار انصاری، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں نمایاں ہیں لیکن مولانا آزاد کی تمام بڑے لیڈروں میں انفرادیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ دو قومی نظریے کی مولانا آخر تک مخالفت کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش پر تعطیل ہونا چاہیے اور اسے حکومت کو قومی دن کے تحت منانا چاہیے۔ گورنمنٹ حامد انٹر کالج کے سابق پرنسپل اسرار احمد نے کہا کہ یوم پیدائش یا یوم وفات منانے کا مقصد کسی کے کارناموں کو یاد کرنا اور آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس کی صدارت سے مولانا نے 30 مارچ کو استعفیٰ دیا اور 6 اپریل کو ملک کو تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مسلم معین قریشی نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے پارلیمنٹ کا پہلا الیکشن رام پور سے لڑا اور مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم رہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم تعلیم کو گھر گھر پھیلائیں۔ ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے کہا کہ مولانا دو قومی نظریے کے مخالف تھے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ تقسیم وطن کے بعد خوں ریزی روکنے میں مولانا آزاد نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ خالد حسن انصاری اور دلن خاں بھارت نے شکریہ ادا کیا۔

سنبھل: آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی اور مصور سبزواری میموریل ادبی سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ جلسے میں مولانا آزاد کے یوم پیدائش "یوم تعلیم" کے طور پر منانے کی ابتدا پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے محمد فرقان سنبھلی نے کہا کہ جنگ آزادی کے عظیم سپاہی اور ملت اسلامیہ کے بیباک اور عظیم قائد کی خدمات کا اعتراف کیا جانا خوش آئند ہے۔ صدارتی خطبے میں معروف شاعر سید حسین افسر نے مولانا آزاد کی ادبی خدمات کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شہزاد احمد، محمد افروز احمد، محمد فرحان، شکیل احمد، مقصود حسین، جمال ایڈووکیٹ، قاسم جمال ایڈووکیٹ، شفیق قریشی، ناظم ایڈووکیٹ، ڈاکٹر سبحان عادل، سردار احمد، ڈاکٹر رضی انور وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ نظامت کے فرائض فرقان سنبھلی نے انجام دیے۔ صدارت سید حسین افسر نے کی۔

امروہہ: مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر ہاشمی گرلس ڈگری کالج میں ان کی یاد میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر سید سراج الدین ہاشمی نے اپنے ڈگری کالج کی لائبریری کو مولانا آزاد کی عظمت کے اعتراف میں اس کا نام تبدیل کرکے مولانا آزاد لائبریری کردیا اور اب اسے اسی نام سے جانا جائے گا۔ اس موقعے پر دہلی سے آئے جناب سہیل اعجاز (ریٹائرڈ جسٹس) نے اپنے خطاب میں امروہہ سے جڑی اپنی یادوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ امروہہ ایک ایسی علمی، ادبی سرزمین ہے جہاں ہر زمانے میں علم و ادب کی شمع روشن رہی ہے۔

مرادآباد: مرکزی حکومت کے اعلان کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کا یوم ولادت "قومی یوم تعلیم" کے طور پر منایا گیا اور یہاں کے کئی تعلیمی اداروں میں اس تقریب کا انعقاد جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ اس سلسلے کی ایک تقریب مولانا آزاد مسلم گرلس انٹر کالج لاکھر میں منعقد کی گئی جس میں کثیر تعداد میں کالج کی طالبات اور استانیاں شریک ہوئیں۔ جلسے کی صدارت بزرگ کانگریس لیڈر اور سابق ایم پی حافظ محمد صدیق نے کی اور نظامت کالج کی ٹیچر غوثیہ بی نے۔ اس موقعے پر مقررین نے سابق وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کی بیش بہا خدمات پر روشنی ڈالی اور بچوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی۔ شہر کے کئی دیگر تعلیمی اداروں میں بھی مولانا آزاد کے حوالے سے تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● ارریہ۔ 11 نومبر، یہاں کے کئی اسکولوں میں مولانا ابوالکلام آزاد ڈے کو "ایجوکیشن ڈے" کے طور پر بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ صبح سے بچوں نے پربھات پھیریاں نکالیں۔ کیریئر گائڈ اکادمی کے طلبہ و طالبات جلوس میں ابوالکلام آزاد زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ساتھ ہی تعلیم کے متعلق کئی تختیاں بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ بعد میں اسکول کے احاطے میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سینئر کانگریسی رہنما محمد طٰہٰ آزاد نے کی۔ اس موقعے پر بچوں نے نعت، ڈرامے اور مقالے پیش کرکے مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اسکول کے ڈائرکٹر پروفیسر رقیب احمد نے کہا کہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی آنکھوں میں ایک سپنا تھا کہ پورا ملک تعلیم یافتہ ہو۔ آج ان کے اس سپنے کو پورا کرکے ہی انھیں صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے۔ آزاد اکادمی اسکول میں بھی ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سابق وزیر الحاج معید الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض ارشد الف نے ادا کیے۔ یہاں بھی طلبہ اور طالبات نے نعت، مقالے، غزل اور مولانا کی سوانح حیات پر روشنی ڈالی۔ الحاج معید الرحمٰن نے طلبہ اور طالبات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کی اچھی تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت بھی ضروری ہے۔ آج ملک میں تعلیمی بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے اس کے باوجود آج بھی بچے گلیوں اور محلوں میں کھیلتے نظر آئیں گے۔ ملک اور قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے تو ایک بھی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس کے لیے ہمیں بھرپور کوشش کرنی پڑے گی۔ انھوں نے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جو ذمے داریاں اٹھائی ہیں وہ ایک چیلنج سے کم نہیں اس کے باوجود جو رزلٹ آرہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اساتذہ میں تعلیم کے فروغ کے لیے کافی لگن ہے۔ مظفر ہاشمی نے کہا کہ آزادی کے اتنے دنوں بعد اب محسوس ہونے لگا ہے کہ تعلیمی بیداری آرہی ہے۔ اسکول

کے ہیڈ ماسٹر محمد مشتاق انجم نے بھی بچوں کی حوصلہ افزائی کی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اقبال تقریبات

● نئی دہلی۔ 8 نومبر، علامہ اقبال نے ہمارے معاشرے کے جمود و تعطل کو ختم کرنے کا کام کیا اور ان کے یہاں فکر و فن کا ایک بحر بیکراں ہے۔ آج ضرورت کلام اقبال کو دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر سید حامد نے آج انٹر لیغچو کولیشن فار پیس اور گاڈ گریس ایجوکیشن گروپ کے زیر اہتمام علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر انصاری آڈیٹوریم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ''جشن اقبال'' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ سید حامد نے کہا کہ اقبال کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے افکار و خیالات کے لیے خود پیکر تراشے اور تلمیحات کے ذریعے فکر و فن کو استحکام عطا کیا۔ معروف شاعر گلزار دہلوی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اپنے بڑے فن کاروں کو جغرافیائی حدود میں بانٹ رکھا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں فکر و فن کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تہذیب و معاشرت کے بے شمار خزینے موجود ہیں۔ جشن اقبال کے روح رواں ڈاکٹر سید ظفر محمود نے کلام اقبال سے اپنے خصوصی شغف کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمارا معاشرہ آج جس بے راہ روی کا شکار ہے اور نئی نسل مغرب پرستی کی طرف جس طرح مائل ہے اسے کلام اقبال کے ذریعے مثبت اور تعمیری رخ پر ڈالا جاسکتا ہے۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے حاضرین کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اقبال نے مغربی استعماریت اور نوآبادیاتی تسلط کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ افتتاحی اجلاس میں گاڈس گریس کے طلبہ کی ایک ٹیم نے ''ترانۂ ہندی'' اور ایک ٹیم نے اقبال کی مشہور نظم ''چاند اور تارے'' پر ایکشن پلے کیا۔ فادر ولیم سیموئل نے کلمات تشکر ادا کیے۔ مقالات کے پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبدالباری نے کی۔ ڈاکٹر مولیٰ بخش نے اقبال کے تصور خودی، پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر نصرت چودھری صاحبہ نے نظم ''طارق کی دعا'' کا تجزیہ پیش کیا۔ پروفیسر شمیمہ رضوی نے نظم ''کوشش ناتمام'' کا تجزیہ پیش کیا۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے ''اقبال دانش روحانی دانش برہانی'' پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر غضنفر نے ''اقبال کا تصور وطن'' پر مقالہ پڑھا۔ صدارتی خطاب میں سید عبدالباری نے اقبال کو ''دانتے'' اور دیگر مغربی شاعروں سے بڑا شاعر قرار دیا۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ یہ سیمینار اقبال شناسی کے نئے باب وا کرے گا۔ انھوں نے نئی نسل کی اقبال کے تئیں دل چسپی کو ایک خوش آئند پہلو قرار دیا۔ اس موقعے پر محمد اسماعیل اور زریں رحمانی نے کلام اقبال کو مترنم آواز میں پیش کیا۔ مقالات کے پہلے اجلاس کی نظامت عمیر منظر نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد نعمان خاں، بلراج کومل، ڈاکٹر شمیمہ رضوی، فاروق صدیقی اور ڈاکٹر ادریس نے کی اور نظامت ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے کی۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے ''اقبال کا تصور تہذیب'' پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر خالد محمود نے ''اقبال اور شاہین'' پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے اقبال کے بچوں سے خطاب پر مقالہ پڑھا اور کنیز فاطمہ نے اقبال کے تصور وطن پر مقالہ پڑھا۔ بعدازاں ڈاکٹر نعمان خاں، بلراج کومل اور فاروق صدیقی نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد۔ 31 اگست، جناب غلام یزدانی کی صدارت میں اردو ہال حمایت نگر میں ''اقبال شناسی'' کی 500 ویں خصوصی نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جناب ضیاء الدین شکیب (لندن) نے ''اقبال اور ہم'' کے عنوان پر خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری نہایت ولولہ انگیز ہونے کی وجہ سے قاری ان کی جانب بار بار راغب ہوتا ہے اور سننے والوں میں درس دینے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ آج دنیا بھر میں اقبال پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ اکادمیاں، انجمنیں قائم کی جارہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے اسلام کو ملاؤں کی گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے عام انسان کے روبرو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ہم کو چاہیے کہ ہم اس عظیم مفکرِ اسلام اور انقلابی شاعر کو سمجھتے ہوئے ان کو اسی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں جیسا کہ وہ تھے۔ جناب ضیاء الدین شکیب نے کہا کہ اقبال کی خواہش تھی کہ اسلام کو عام انسان کو بھی سمجھنا چاہیے۔ وہ دورِ جدید کے مسائل کے حل کو اسلام میں پانے کے بعد انسانیت کو فیض پہنچانے کے خواہشمند تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ اس مادہ پرست دنیا میں مادّی آسودگی تو حاصل ہو رہی ہے مگر انسان کی زندگی سے روحانیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ روحانیت کو تازہ کرنے کے لیے انھوں نے عشق کے نظریے کو پیش کیا۔ وہ مسلمانوں کو عشق محمدیؐ اور عشق خدا میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ قبل ازیں معتمد اقبال اکادمی حیدرآباد جناب سید امتیاز الدین کی تلاوتِ کلام مجید سے تقریب کا آغاز ہوا۔ جناب امتیاز الدین نے محافل اقبال شناسی پر مکمل رپورٹ پیش کی۔ جناب مظفر مجاز نے اقبال شناسی کی 500 ویں نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ان کی آفاقی شاعری نے تقریباً تمام متمدن ممالک پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہر زبان و ادب نے ترجمے کے ذریعے ان کی فکر و نظر کو بالفاظِ دیگر اقبال کے پیام کو دنیا کے سامنے رکھا۔ ''ستاروں سے

آگے جہاں اور بھی ہیں" جیسی حقیقت کا اظہار کرنے والے دیدہ ور نے شاعری کے پردے میں پیامبری کرتے ہوئے "تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول" جیسا پیام دے کر دنیا کو نئی نئی منزلیں کھوج نکالنے کا شوق دیا، عمل پیہم کی تلقین و ترغیب دی۔ اقبال نے واضح کیا کہ جنت اور جہنم بھی عمل سے ہی بنتی ہیں۔ اس موقعے پر مختلف محافل اقبال شناسی میں پیش کردہ منتخب کلام اقبال کی سی ڈی کی رسم اجرا ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کے ہاتھوں عمل میں لائی گئی۔

(منصف، حیدرآباد)

حکیم اجمل خاں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے

● نئی دہلی۔ 2 نومبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 88ویں یوم تاسیس کے موقعے پر جامعہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے حکیم اجمل خاں میموریل لکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال احمد فاروقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر انیس احمد انصاری، ایسوسی ایشن کے صدر جاوید عالم، سکریٹری ارشد ذیشان کے علاوہ جامعہ کے متعدد پروفیسر اور لکچرار اور ایسوسی ایشن کے ممبران نے شرکت کی۔ جناب کمال فاروقی نے کہا کہ حکیم اجمل خاں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر تھی۔ خاص طور سے ملک کی سیاست پر۔ مسلم لیگ سے لے کر ہندو مہا سبھا تک ہر حلقے میں وہ مقبول تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا کل اثاثہ طبیہ کالج پر لگا دیا لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج کالج کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ انھوں نے حکیم اجمل خاں کو نوجوانوں کے لیے آئیڈیل قرار دیا۔ پروگرام کے خصوصی مقرر پروفیسر انیس احمد انصاری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر کا یہ جملہ نقل کیا کہ قرول باغ کا طبیہ کالج حکیم اجمل خان کی جوانی کی اولاد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ان کے بڑھاپے کی اولاد ہیں۔ انھیں جامعہ ملیہ کا پہلا چانسلر بنایا گیا تھا۔ انھوں نے آیورویدک اور یونانی میں پہل کرتے ہوئے ریسرچ کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی تھی۔ انھوں نے 1916 میں برٹش حکومت کے بلیک ایکٹ کے خلاف سخت احتجاج کیا جس سے مجبور ہو کر یہ ایکٹ حکومت کو واپس لینا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ حکیم صاحب نے برٹش حکومت کے حاذق الملک کے ایوارڈ کو بھی ٹھکرا دیا تھا جس سے ملک کے عوام نے خوش ہو کر انھیں مسیح الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

اردو اساتذہ اکادمی کا قیام

● نئی دہلی۔ 23 اکتوبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اردو اکادمی اساتذہ قائم کی گئی ہے، جس کے ڈائرکٹر تدریسیات کے ماہر ڈاکٹر غضنفر بنائے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنا کام کاج بھی شروع کر دیا ہے۔ آج یہاں جاری ایک بیان میں اکادمی کے ڈائرکٹر نے کہا کہ کسی بھی زبان کے فروغ کا عمل اس زبان کی تعلیم و تدریس کی صورت حال سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ اردو بھی اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اردو اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کی ترقی اور تربیت کا انتظام پہلے سے موجود ہے مگر ابتدائی اور ثانوی سطحوں کے اردو اساتذہ اب تک اس نوعیت کی باضابطہ تربیتی سہولت سے محروم تھے۔ انھوں نے کہا کہ فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت کی جانب سے ملک کی تین یونیورسٹیوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو اساتذہ اردو میڈیم اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کے فروغ، اردو درس و تدریس کے معیار کی بلندی اور اردو ذریعۂ تعلیم کی بہتری و قدر افزائی کے لیے اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ کا قیام اس کی کمی کو پورا کرنے سے متعلق ایک اہم پیش رفت ہے۔ ڈاکٹر غضنفر نے کہا کہ تینوں یونیورسٹیوں کی اردو اساتذہ اکادمیوں کو مختلف ریاستوں کی ذمے داری دی گئی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو اساتذہ اکادمی کا دائرۂ اختیار دہلی، ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش اور راجستھان کو محیط ہے۔ انھوں نے اپنے نوتشکیل ادارے کے منصوبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو اساتذہ اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے آنے والے دنوں میں اردو اساتذہ کے لیے قلیل مدتی تربیتی پروگرام، تدریسی مواد کی ترتیب و تشکیل، ترغیبی، حوصلہ افزا پروگرام، ہدایات و اطلاعات رسانی اور دیگر اردو کورس وضع کرنے کی سرگرمیوں کا ایک تفصیلی خاکہ مرتب کیا ہے لیکن اس خاکے میں فکر و عمل کے رنگ بھرنے کے لیے اکادمی کی اپنی کوششوں سے کہیں زیادہ اردو تعلیمی اداروں اور اردو اساتذہ کا فعال اشتراک و تعاون ضروری ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کے فروغ اور بقا کی بہت سی کوششیں اب تک صرف اس وجہ سے ناکام ہوتی رہی ہیں کہ انھیں خود اردو والوں کا سرگرم تعاون اور حمایت حاصل نہیں ہو پاتی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ یہ اکادمی طلبہ اور اساتذہ کی بنیادی ضرورتوں اور زبان و ادب کے تمام اہم گوشوں پر خصوصی توجہ دے گی اور اردو والوں کا اشتراک و تعاون ملتا رہا تو یہ اردو کے فروغ کا ایک حقیقی ذریعہ بنے گی۔ ڈاکٹر غضنفر نے کہا کہ اردو ادب کی تدریس اور اردو کے ذریعے پڑھائے جانے والے کسی بھی مضمون کا کوئی بھی مسئلہ ہو، خواہ رسم خط سے متعلق یا املا، انشا، قواعد، اصطلاحات، لغت، بدیع و بیان، لفظ و معنی، تحسین و تفہیم کا یا پھر ترجمے اور ترجمانی کا، تدریس کی منصوبہ بندی اور طریقۂ کار کی ترتیب و تنظیم کا تو اردو اساتذہ بلا کسی پس و پیش اور تکلف کے اکادمی سے رابطہ کر سکتے ہیں بلکہ اکادمی انھیں دعوت دیتی ہے کہ اس سلسلے میں ذاتی رابطہ کریں یا خط لکھیں، فون کریں یا ای میل کریں۔ انھوں نے کہا کہ

اکادمی اردو اساتذہ کے تمام سوالوں کے جواب دینے اور مسائل کا حل فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ڈاکٹر غضنفر نے کہا کہ حکومت ہند نے اردو تدریس وتربیت کو فروغ دینے کے لیے اردو اساتذہ اکادمی کی صورت میں جو سہولت فراہم کی ہے، اردو والوں کو اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اکادمی اردو تعلیمی اداروں اور اساتذہ سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اس شاخ امید کو ثمرآور کرنے کے لیے اپنی اردو دوستی اور زبان پروری کے جذبات سے اس کی آبیاری کریں گے۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

مشاہیر جامعہ کی اردو خدمات پر سیمینار

● نئی دہلی۔ 4 نومبر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ''مشاہیر جامعہ کی اردو خدمات'' کے موضوع پر تعلیمی میلے میں ریسرچ اسکالرز سیمینار کا اہتمام کیا گیا، صدارت کے فرائض ڈاکٹر علی جاوید نے انجام دیے۔ جامعہ کے دو قدیم طلبہ جناب غلام حیدر اور ڈاکٹر شکیل اختر بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ سیمینار کے کنوینر پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جلسے کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ تعلیم گاہیں تو بہت ہیں مگر جامعہ کا امتیاز یہ ہے کہ یہ تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ تربیت گاہ بھی ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی نے جامعہ اور افراد جامعہ سے متعلق متعدد کتابوں اور واقعات کے حوالے سے گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ موضوع چاہے جو بھی ہو ریسرچ اسکالرز کو ریسرچ کے آداب و اصول کو بہرحال پیش نظر رکھنا ہوگا اور جامعہ کے ان مشاہیر کی بہت سی کتابوں اور ان پر لکھی گئی کتابوں سے اس ضمن میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ افراد جامعہ فقر واستغنا کی ایک روشن مثال تھے، آج کے زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر شکیل اختر فاروقی نے عبدالغفار مدھولی کی شخصیت اور بحیثیت استاد ان کے مختلف کارناموں کو طلبہ کے سامنے پیش کیا۔ جناب غلام حیدر نے جامعہ کے ایام گذشتہ کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ یہاں طلبہ کے درمیان اخوت ومحبت کی جو فضا تھی اس سے طلبہ کے مذہب کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ یہ ادارہ ہمیشہ سے سیکولر قدروں کا امین رہا ہے۔ شعبے کی اسکالر فاطمہ جبیں نے جامعہ کی مصنفات پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے صالحہ عابد حسین، قدسیہ زیدی، بیگم آصف مجیب، پروفیسر صغریٰ مہدی کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا، عبدالحمید نے مولانا محمد علی جوہر کی صحافتی خدمات پر مقالہ پڑھا، انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کی پہچان مولانا محمد علی جوہر سے عبارت ہے۔ غلام ہندوستان میں انھوں نے حریت فکروعمل کے جو پہلو نمایاں کیے آزاد ہندوستان بالخصوص موجودہ الیکٹرانک میڈیا ان سے بالکل عاری ہے۔ خالد مبشر نے سید عابد حسین کے تصور قومیت پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ثقافتی فاشزم کے اس دور میں ضرورت ہے کہ ہندوستان کی تمام تعلیم گاہوں میں اس کتاب کو متحدہ ومشترکہ قومیت کے فروغ کے لیے شامل نصاب کیا جائے۔ خالد انجم عثمانی نے حکیم اجمل خاں کی علمی، ادبی اور شعری خدمات کا احاطہ کیا اور کہا کہ وہ ایک محب وطن بھی تھے اور شاعر وصحافی بھی اور سماج کے سچے خدمت گار بھی۔ منظر علی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی کتاب ''شہید جستجو'' کا مطالعہ پیش کیا، طلبہ کی ان کاوشوں کو اساتذہ اور دیگر مہمانان نے سراہا۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر خالد محمود اور سہیل احمد فاروقی نے ان مقالات پر اظہار خیال بھی کیا اور طلبہ کی رہنمائی بھی کی۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

اردو کے مخالفین ملک دشمن ہیں

● گیا۔ 19 ستمبر، یہودیوں نے بے وطنی کے باوجود دو ہزار برس تک اپنے افکار اور زبان کی حفاظت کی اور ہم آزادی کے 60 سالوں میں ہی اردو کا ماتم کرنے لگے، لال قلعہ، تاج محل، مہابودھی مندر کی طرح اردو بھی ہندوستان کی میراث ہے۔ اردو کی ترویج وترقی، اس کی حفاظت، قومی ورثے کی حفاظت کے مترادف ہے۔ اردو کے مخالف ملک کے دشمن ہیں، قومی وراثت کے دشمن ہیں۔ یہ باتیں جشن ادریس اور مخدوم محی الدین کے موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام گیا میں منعقد سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے بہار کے سابق وزیر اور اردو کے ممتاز شاعر ادیب نقاد پروفیسر لطف الرحمٰن نے کہیں۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے کہا کہ یہودیوں کی کل تعداد فقط ایک کروڑ ہے لیکن ان کی جھولی میں ساڑھے تین سو نوبل پرائز ہیں، جب کہ پوری دنیا میں عیسائیوں کے بعد مسلمانوں کی تعداد ہے پھر بھی نوبل پرائز صرف تین یا 4 عدد ملے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے ہندوستان میں جاری دہشت گردی کے لیے اسرائیل کو ذمے دار ٹھہرایا اور کہا کہ ہندوستان میں دہشت گردی کے واقعات کا محرک اسرائیل ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے اسباب پر بھی گفتگو کی اور کہا کہ جب سرسید نے عصری اور انگریزی تعلیم کی طرف قوم کو راغب کیا تب ان کی شدید مخالفت ہوئی لیکن انھی دنوں راجا رام موہن رائے نے جب اپنی قوم میں اصلاحات شروع کیں تو ان کی قوم نے لبیک کہا اور عصری تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئے، مسلم قوم نے سرسید کی تحریکات کی مخالفت میں بیشتر وقت گنوا دیا، چنانچہ کافی تاخیر سے مسلمانوں نے تعلیم کا آغاز کیا۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

اردو یونیورسٹی کے اورنگ آباد کیمپس کے لیے اراضی کا عطیہ

● حیدرآباد۔ 14 اکتوبر، اردو کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی انتھک کوششوں کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے محترمہ فوزیہ تحسین احمد خاں، رکن قانون ساز کونسل (مہاراشٹر) نے اورنگ آباد میں یونیورسٹی کیمپس کے قیام کے لیے 5 ایکڑ اراضی کے عطیے کا اعلان کیا ہے۔ محترمہ فوزیہ تحسین نے جو اردو یونیورسٹی کی خصوصی دعوت پر یونیورسٹی کیمپس (گچی باؤلی، حیدرآباد) تشریف لائی تھیں، پرو وائس چانسلر یونیورسٹی و ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم پروفیسر کے آر اقبال احمد سے ملاقات کی اور مختلف امور پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ پروفیسر اقبال احمد نے اردو یونیورسٹی کے لیے اراضی کا عطیہ دینے پر محترمہ فوزیہ تحسین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اردو یونیورسٹی کے مجوزہ اورنگ آباد کیمپس میں بی۔ ایڈ۔ اور پالی ٹیکنک کالجز کے علاوہ ماڈل اسکول قائم کیا جائے گا۔ محترمہ فوزیہ تحسین نے اراضی کے عطیے کے تعلق سے کہا کہ یہ محض اردو کی خدمت کے جذبے کے تحت کیا گیا اقدام ہے۔ انھوں نے اورنگ آباد میں اردو یونیورسٹی کے مجوزہ کیمپس کو اس تاریخی شہر کے لیے ایک انمول تحفہ قرار دیا۔ محترمہ فوزیہ تحسین نے مہاراشٹرا کے ضلع پربھنی میں بھی اردو یونیورسٹی کی سرگرمیوں کو وسعت دینے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ ضلع پربھنی میں اہل اردو کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ پروفیسر اقبال احمد نے انھیں تیقن دیا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بہت جلد پربھنی میں فنی (Vocational) کورسز کے آغاز کا منصوبہ رکھتی ہے۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کے کیمپس پر مبنی اور فاصلاتی کورسز کی تفصیلات سے مہمان وفد کو آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ فاصلاتی تعلیم کے طلبہ کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے ان میں 55 فیصد خواتین ہیں۔ اس طرز تعلیم سے استفادہ کرنے والی خواتین تقریباً 50 فیصد گرہست ہیں۔ اردو یونیورسٹی کے کیمپس پر مبنی کورس کی مقبولیت میں بھی دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ پروفیسر اقبال احمد نے بتایا کہ دربھنگہ، بھوپال، بنگلور اور نوح (ہریانہ) میں اردو یونیورسٹی کیمپس کے لیے مختلف اداروں اور مخیر حضرات نے قیمتی اراضی کے عطیے دیے ہیں۔ جناب تحسین احمد خاں (پربھنی) نے جو مہمان وفد میں شامل تھے، اردو طلبہ میں خود اعتمادی کے جذبے کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر اقبال احمد نے اورنگ آباد میں اراضی کا عطیہ دینے پر محترمہ فوزیہ تحسین کے فیصلے پر وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کی جانب سے اظہار ستائش اور اظہار تشکر کیا۔ ملاقات کے دوران پروفیسر وہاب قیصر، ڈاکٹر علی رضا موسوی، ڈاکٹر نثار احمد ملا، ڈاکٹر سلیل قادر (نظامت فاصلاتی تعلیم)، مشتاق علی شاہ (انچارج اسٹڈی سنٹر پربھنی) اور فہیم احمد موجود تھے۔

(ڈاک سے)

اردو مشترکہ تہذیب کی علامت

● سری نگر۔ 30 جولائی، جموں و کشمیر کے گورنر این این ووہرا نے آج اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ کچھ لوگ اردو کو ایک مخصوص فرقے کی زبان قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ پانچ چھ سو سال پہلے وجود میں آنے والی یہ زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ ووہرا نے کشمیر یونیورسٹی میں کل ہند یونیورسٹی اردو اساتذہ تنظیم کے 20 ویں اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے اردو اور دیگر زبانوں کی ترقی اور فروغ کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال پر زور دیا۔ مرزا غالب، محمد اقبال اور فراق گورکھپوری کی گرانقدر خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں 27 کروڑ سے زیادہ لوگ اردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ گورنر نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی سطح پر اردو تعلیم کے بہتر انتظام پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اسکولوں کی سطح پر اس کے لیے ابھی کافی کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ریاض پنجابی نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں اردو بولنے والے لوگوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اردو کی کافی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور مختلف یوروپی ممالک میں اردو رسائل کی اشاعت سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اردو اپنی جنم بھومی سے باہر بھی مقبول ہو رہی ہے۔

(سالار، بنگلور)

فارسی ادب میں روایت اور تجدد

● نئی دہلی۔ 27 اکتوبر، سینٹر فار پرشین اینڈ سینٹرل ایشین اسٹڈیز اور مرکز تحقیقات فارسی کے باہمی تعاون سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، اسکول آف لینگویجز کے کمیٹی ہال میں "فارسی ادب میں روایت اور تجدد" کے عنوان سے ایک روزہ سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے کی اور ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالحمید ضیاء اور مرکز تحقیقات کے ڈاکٹر علی رضا قزوہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور نظامت کے فرائض شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے انجام دیے۔

پروگرام کی ابتدا میں شعبۂ فارسی کے چیئرمین پروفیسر اختر مہدی نے تمام حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے سیمینار کے اغراض و مقاصد اور موضوع کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ درحقیقت روایت اور تجدد کے

درمیان چولی اور دامن جیسا گہرا رابطہ ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوگا کہ تجدد انسانی معاشرے کی ترقی و خوشحالی کی اہم علامت ہے۔ اگر تجدد اور نوآوری وخلاقیت کونظرانداز کردیا جائے تو ادب پر جمود طاری ہوجانا یقینی ہے۔ جہاں تک فارسی ادب کا سوال ہے نیمایوشیج کو روایت اور تجدد کے بابائے آدم کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔

فارسی ادب کے جن نامور شعرا کو آج ہم روایت کا علمبردار کہتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے دور کے بہت بڑے تجدد پسند کی حیثیت سے شہرت ومقبولیت کی معراج حاصل کیے ہوئے تھے۔ ان شعرا کی فہرست میں مولانا رومی، شیخ سعدی اور حافظ شیرازی جیسے درخشاں چہرے بھی نظر آتے ہیں اور حافظ شیرازی کا یہ شعر اس دعوے کی بہترین دلیل ہے:

بیا تا گل بافشانیم و مئے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرح نو باندازیم

انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان اور ایران جیسے ثقافتی سرمائے سے مالا مال ممالک میں روایت نے ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے اور تجدد اور نوآوری ان دونوں ممالک کے لوگوں کی ثقافتی اور فنی زندگی کا اٹوٹ حصہ رہی ہے۔ اس موقعے پر ایران سے آئے ہوئے 3 اساتذہ ڈاکٹر حسین اسرافیلی، ڈاکٹر پرویز بیگی حبیب آباد اور مصطفیٰ علی پور نے جو عصر حاضر کے نامور فارسی شاعر بھی ہیں، اپنے مقالات اور اشعار پیش کیے۔ ڈاکٹر علی رضا قزوہ اور ڈاکٹر عبدالحمید ضیائی نے اپنی تقریروں میں قیصر امین پور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری اور روایت وتجدد کے حوالے سے ان کے نظریات کا ذکر کیا۔ سیمینار کے آخری حصے میں امیر حسن عابدی نے خطبۂ افتتاحیہ پیش کیا اور ان کے دعائیہ کلمات کے ساتھ یہ سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ سیمینار میں شعبۂ فارسی جے این یو کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر عبدالحلیم، ڈاکٹر کلیم اصغر، ڈاکٹر محمود فیاض اور ڈاکٹر ممتاز احمد وغیرہ نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''میرے زمانے کی دہلی'' کے عنوان سے ایک ادبی محفل

● نئی دہلی۔ 7 نومبر، اردو رسم الخط کو ختم کرنے کی منظم طور پر سازش ہورہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں سے اردو کو ختم کیا جارہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کیا۔ وہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے اردو گھر میں منعقدہ ''میرے زمانے کی دہلی'' میں بطور مہمان خصوصی اپنے تاثرات پیش کررہے تھے۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خلیق انجم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر گلزار دہلوی نے آزادی سے قبل کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے آج تک کے حالات پر روشنی ڈالی اور اس خوبصورتی سے روشنی ڈالی کہ پوری دہلی کی تصویر ابھر آئی۔ قبل ازیں ڈاکٹر انجم نے کہا کہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام پہلے بھی ادبی نشستیں ہوتی تھیں لیکن کسی وجہ سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اسے غالب انسٹی ٹیوٹ نے دوبارہ شروع کیا اور آج بھی بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں جس کے تحت ہر ماہ کے آخری ہفتے کو ادبی نشست ہوتی ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ اردو گھر کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے لہٰذا ''میرے زمانے کی دہلی'' کے عنوان سے ایک نئی نشست شروع کی ہے جس میں ہر بار کسی ادبی شخصیت کو دعوت دی جائے گی جو کہ دہلی کی تاریخ کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے جن کا ذکر نہ تو کتابوں میں ہے نہ کہیں اور۔ انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اس کی شروعات گلزار دہلوی کررہے ہیں کیونکہ جتنا یہ دہلی کو جانتے ہیں شاید ہی اتنا اب کوئی جانتا ہو۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ گلزار دہلوی ایک پوری کتاب ہیں اور یہ وہ کتاب ہے جو کسی لائبریری یا کتاب گھر میں موجود نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ گلزار صاحب نے جس طرح سے سیتارام بازار، کلاں محل اور پرانی دہلی کی تاریخ پیش کی ہے وہ انھی کا حق ہے۔ اس موقعے پر سامعین نے گلزار دہلوی سے سوال بھی کیے جن میں ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر موہنی انجم، مخمور سعیدی، انور کمال حسینی، سید ضمیر حسن، ثاقب صدیقی، مظہر عباس نقوی، انیس احمد وارثی، شاہد خان اور جاوید رحمانی شامل تھے۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کا بیالیسواں یوم تاسیس

● اردو، بنگلہ اور ہندی کے مقتدر قلم کاروں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن نے جو ادبی اعزازات پیش کیے ہیں ان میں محبت کی حرارت بھی ہے اور ٹھنڈک بھی، کیوں کہ سرزمین ہوڑہ کی ادبی مجلسوں میں واقعی علمی چمک پائی جاتی ہے۔ بالخصوص ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کی ادبی نشستیں اس انداز کی ہوتی ہیں جہاں قلم کار کو ادبی وعلمی گفتگو سے ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس ادارے نے 42 سال کا طویل ادبی سفر طے کرلیا ہے اور اس کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے بلاتردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حیثیت تاریخی ہوچکی ہے۔ اس خیال کا اظہار مدیر ماہنامہ ''انشا'' کولکاتا جناب ف.س. اعجاز نے 19 اکتوبر 2008 ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کے 42ویں یوم تاسیس اور تقریب اعزاز کے صدارتی خطبے میں کیا۔

مہمان خاص کی حیثیت سے بنگلہ زبان کے مشہور اور معمر ادیب شری برج موہن مجمدار نے اپنی پُرمغز تقریر میں کہا کہ جناب قیصر شمیم نے اردو، ہندی اور بنگلہ کے قلم کاروں کا بین اللسانی و بین المذاہب ادبی ادارہ ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن قائم کرکے سماج میں پھیلی خرابیوں کو ادب کے ذریعے دور

کرنے کے لیے جو کام کیا ہے وہ قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی ہے۔ مذاہب کا خاص کام اتحاد و اتفاق کو فروغ دے کر تعصب کو جڑ سے ختم کرنا ہے۔

یوم تاسیس کے موقعے پر ادارہ ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کے موسس اور نامور شاعر قیصر شمیم نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں حاضرینِ محفل کو عید، درگا پوجا اور لکشمی پوجا کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور کہا کہ ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن اپنے آغاز ہی سے اس اصول پر کاربند ہے کہ تعصب و نفرت کی دیوار کو ڈھا کر محبت و اخوت کی ایسی ٹھوس راہ ہموار کی جائے کہ مسموم فضا کو پنپنے کا موقع نہ ملے یہ ادارہ اسی ضابطے پر کاربند ہے:

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اس موقعے پر اراکین ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن نے اردو، بنگلہ اور ہندی کے ممتاز قلم کاروں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ہدیۂ تبریک کی صورت میں شال، میمنٹو اور سپاس نامے پیش کیے۔ اعزاز یافتہ شعرا و ادبا میں اردو کے معروف ناقد و مترجم اور ''بدلتے زاویے'' کے خالق جناب ایم جلی، مشہور شاعر و صحافی جناب فراغ روہوی، بنگلہ کے ممتاز شاعر و ادیب شعری سدھارت سرکار اور ہندی کے مشہور اسکالر پروفیسر شیام لال اپادھیائے شامل تھے۔

مذکورہ صاحبانِ اعزاز کو صدر جلسہ جناب ف.س.اعجاز نے شال پیش کیے، جبکہ شری برج موہن مجمدار نے انھیں میمنٹو پیش کیے۔ ڈاکٹر مشتاق انجم، سید حسن، شری سنت کمار داس اور ڈاکٹر ہری کنور رائے کنور نے بالترتیب صاحبانِ اعزاز کے تعلق سے سپاس نامے پڑھے اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے مختصراً اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ اس کے بعد تمام صاحبانِ اعزاز نے اظہار ممنونیت کے طور پر کلمات ادا کیے۔

تمام مہمانوں کی خدمت میں پھولوں کا ہار پیش کر کے تقریب یوم تاسیس کا آغاز کیا گیا۔ ادارہ کے فعال سکریٹری جناب ایم. نصر اللہ نصر نے ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کی ادبی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی اور جلسے کے اختتام تک بحسن و خوبی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر کولکاتا و ہوڑہ کے علاوہ قرب و جوار سے ادبا و شعرا اور علم دوست حضرات کی کثیر تعداد جلسہ گاہ میں اخیر تک موجود تھی۔ (ڈاک سے)

ڈاکٹر جی این قاضی جامعہ ہمدرد کے نئے وائس چانسلر

● نئی دہلی۔13 اکتوبر، ڈاکٹر جی این قاضی، جامعہ ہمدرد کے نئے وائس چانسلر بنائے گئے ہیں۔ انھوں نے آج اپنے عہدے کا چارج لے لیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر شمیم احمد کی جگہ لی ہے جن کے عہدے کی مدت 11 اکتوبر کو ختم ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر جی.این. قاضی اب تک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انٹیگریٹیو میڈیسن (IIIM) جموں میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ڈاکٹر قاضی کا دنیا بھر میں ایک معروف بایوٹیکنالوجسٹ کی حیثیت سے نام ہے۔ وہ تقریباً 40 برسوں سے بایوکیمسٹری، مائکروبایوٹیکنالوجی اور نیچرل پروڈکٹس کی بائیو پروسیسنگ کے میدانوں میں کام کر رہے ہیں۔ انھیں فرمنٹیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کے لیے Vasvik اور سی.ایس.آئی.آر ٹیکنالوجی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

خلیل مامون — کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین نامزد

● بنگلور۔ اردو حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ حکومت کرناٹک نے جناب خلیل مامون کو کرناٹک اردو اکادمی کا چیئرمین نامزد کیا ہے۔ خلیل مامون صاحب کرناٹک میں آئی جی رہ چکے ہیں لیکن ادبی دنیا انھیں ایک خوش فکر شاعر، تازہ کار ادیب اور ذمے دار صحافی کے طور پر جانتی ہے۔ انھیں مرحوم محمود ایاز سے بھی قربت رہی ہے جن کا رسالہ ''سوغات'' ادبی صحافت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اردو حلقوں میں اس توقع کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ خلیل مامون کے دور صدارت میں کرناٹک اردو اکادمی کی فعالیت اور کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔ (سالار، بنگلور)

اعزاز و اکرام

● نئی دہلی۔ 18 اکتوبر، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہیتے مرید، فارسی، اردو اور ہندی کے سرپرست اور فن موسیقی کے ماہر حضرت خواجہ امیر خسروؒ دہلوی کے 604 ویں عرس کے موقع پر پہلا خواجہ حسن نظامی میموریل ایوارڈ برائے خسرو شناسی، پروفیسر محمد مجیب حسین رضوی کو حضرت خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کا اہتمام اس سوسائٹی نے خواجہ ہال میں کیا، جس میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر کریم نجفی شریک ہوئے اور صدارت جامعہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے اور نظامت خواجہ حسن ثانی نظامی نے کی۔

شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے امیر خسرو کی عشقیہ شاعری پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو کے یہاں عشق ایک دل کی کائنات ہے، ان کی شاعری میں فلسفۂ حیات اور تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے پروفیسر مجیب حسین رضوی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مجیب حسین رضوی نے ہر رخ سے حضرت امیر خسرو کا مطالعہ کیا ہے۔ سکریٹری غالب اکیڈمی ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ حضرت امیر خسرو کو ہندی اور اردو والے اپنا پہلا شاعر کہا کرتے ہیں۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر کریم نجفی اور سید شاہد مہدی کے ہاتھوں پروفیسر رضوی کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ سید شاہد مہدی اور ایران کے ڈاکٹر کریم نجفی نے ڈاکٹر رضوی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو نہ صرف اردو کے شاعر تھے بلکہ فارسی اور ہندی کے بھی زبردست شاعر ہیں۔ متین امروہوی اور نسیم عباسی نے ڈاکٹر رضوی کو تہنیتی اشعار پیش کر کے مبارک باد پیش کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ۔ 22 اکتوبر، پاکستان کے ممتاز ادیب اور سماجی کارکن محمد ذاکر علی خاں کو سرسید احمد خاں انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازے جانے پر وائس چانسلر لاج پر ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پرو وائس چانسلر نواب رحمت اللہ خاں شیروانی نے فرمائی۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ ڈاکٹر علی کی شخصیت علی گڑھ برادری کے لیے ایک نمونۂ عمل ہے۔ انھوں نے سرسید مشن کو عام کرنے کے لیے پاکستان کے کراچی شہر میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور علی گڑھ برادری کو ایک پیغام دیا ہے کہ کس طرح سرسید مشن کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ ذاکر علی خاں گذشتہ 50 سال سے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ پاکستان میں اپنے علیگ بھائیوں میں کتنے مقبول ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فرزندان علی گڑھ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور سماج میں انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ بھی اپنے اپنے علاقوں میں ادارے قائم کریں تاکہ مسلمانوں کی ناخواندگی اور پسماندگی کو دور کرنے کے لیے سرسید احمد خاں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جاسکے۔

پروفیسر عزیز نے کہا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ بانی درسگاہ کے نام پر عالمی ایوارڈ ہر سال دیا جائے۔ یونیورسٹی کی ایگزیکیٹیو کونسل نے اس فیصلے کی توثیق کر دی تھی اور انھیں فخر ہے کہ پہلا ایوارڈ ایک علیگ کو دیا گیا ہے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پرو وائس چانسلر نواب رحمت اللہ خاں شیروانی نے کہا کہ ذاکر علی خاں نے سرسید کے نام پر ایک یونیورسٹی قائم کر کے علیگ برادری کے سامنے ایک نظیر پیش کی ہے۔ اس موقعے پر ذاکر علی خاں نے کہا کہ وہ اپنی زندگی کے 80 سال مکمل کر چکے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اس ادارے کا ہی طفیل ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اعزاز ان سب لوگوں کی خدمات کا صلہ ہے جنھوں نے پاکستان میں سرسید کے مشن کو عملی طور پر اپنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں اس مادر علمی کا ایک سپوت ہوں اور اس ادارے نے نہ صرف تعلیم دی بلکہ زندگی میں آگے بڑھنے کا ہنر بھی سکھایا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سہارنپور۔ 14 اکتوبر، تدریسی خدمات کے اعتراف میں یوپی کے محکمۂ ایجوکیشن نے اردو ٹیچر ماسٹر محمد نعیم طالب اور اردو استانی انیس فاطمہ کو یوپی اسٹیٹ ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔ ایوارڈ توصیفی سند اور ایک معقول رقم پر مشتمل ہے۔ اردو کے ان دونوں خادموں کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیے جانے پر اردو حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ضلع میں کافی عرصے کے بعد اردو اساتذہ کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ماسٹر محمد نعیم طالب 1992 سے اردو کی درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کا شمار اردو کے لائق اور محنتی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انیس فاطمہ اردو کے معروف صحافی اور شاعر قاری محمد اسحق حافظ کی صاحبزادی اور ایڈیشنل بی ایس اے ریٹائرڈ خورشید احمد کی اہلیہ ہیں اور اردو اساتذہ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں کو اسٹنٹ ایوارڈ کے لیے منتخب کیے جانے پر ضلع اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر عبدالستار نے مسرت ظاہر کی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● لکھنؤ۔ اترپردیش کی وزیراعلیٰ مایاوتی کے اعلان پر عمل کرتے ہوئے اترپردیش کی انتظامیہ نے ایک سالہ اردو جرنلزم ڈپلوما کورس کا نصاب تیار کرنے اور اسے شروع کرنے کی رہنما ہدایات جاری کی ہیں۔ اس کورس میں پڑھنے والے طلبہ کو 4824 روپے دیے جائیں گے۔ وزیراعلیٰ کے سکریٹری برائے اقلیتی بہبود نوین سہگل نے آج یہاں یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ ایک سالہ اردو جرنلزم ڈپلوما کورس کو چلانے کے لیے ایسے رجسٹرڈ اداروں سے معاہدہ کیا جائے گا جو کم از کم پانچ برسوں سے اردو صحافت کے پروگرام چلا رہے ہیں۔ اس سمجھوتے میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ متعلقہ ادارہ، مدرسہ ایجوکیشن کونسل کی ماتحتی میں اور اس کی ہدایات کے مطابق کام کریں گے۔ پورے کورس کو اترپردیش مدرسہ ایجوکیشن کی نگرانی میں چلایا جائے گا۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● میدک۔ 8 اکتوبر، صدر نشین بلدیہ میدک و انچارج تلگو دیشم بی جگو پتی نے اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دینے کا ریاستی حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس حکومت اقلیتوں کی فلاح و بہبودی سے متعلق اعلانات، عملی اقدامات سے عاری ہیں۔ سابق تلگو دیشم حکومت نے سال 1998 میں ایک جی او جاری کرتے ہوئے اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل موقف کا درجہ دیا تھا جس کے باعث فاضل کامیاب طلبہ گریجویشن کے علاوہ ڈائٹ میں داخلہ حاصل کرتے ہوئے اپنے مستقبل کو درخشاں بنا رہے تھے لیکن کانگریس حکومت نے سال 2005 میں اس حکم نامے کو منسوخ کرتے ہوئے

اردو فاضل کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے مستقبل کو تاریک بنا دیا۔ صدر نشین بلدیہ نے چیف منسٹر ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی کو تحریر کردہ اپنے مکتوب میں مطالبہ کیا کہ وہ اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیتے ہوئے تلگو دیشم دور حکومت میں جاری کردہ حکم نامے کو بحال کریں۔

(منصف، حیدرآباد)

● لکھنؤ۔ 13 اکتوبر، سہ لسانی فارمولہ میں اردو کو شامل کیا جائے اور ہر اسکول میں آٹھویں جماعت تک اردو اساتذہ کی تقرری لازمی کی جائے۔ جس طرح دیگر صوبوں میں اردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کو تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح اردو میڈیم اسکول کھولنے کے لیے ریاستی حکومت اپنی منظوری اور مالی تعاون فراہم کرے۔ یہ مطالبہ غنی تعلیمی مرکز کے جنرل سکریٹری عبدالنصیر ناصر نے وزیر اعلیٰ مایاوتی کو ارسال کردہ خط میں کیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں کنونشن طلب کرنے کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اتر پردیش کمیشن، مادھیمک شکشا پریشد و دیگر امتحانوں کے سوال ناموں میں ہندی انگریزی کی طرح اردو کو بھی شامل کیا جائے اور سوالوں کے جوابات اردو میں بھی دینے کی سہولت فراہم کی جائے۔ پی سی ایس (جے) میں اردو کو دوبارہ شامل کیا جائے۔ انفارمیشن افسر کے لیے اردو جاننا لازمی تھا اس شرط کو پھر بحال کیا جائے۔ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لہٰذا ہر سرکاری دفتر میں ایک اردو مترجم کی تقرری کی جائے۔ ریاست کے سبھی سرکاری دفتروں کی نیم پلیٹوں اور سائن بورڈوں کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے کے سرکاری حکم پر عمل کیا جائے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● دیوبند۔ 27 اکتوبر، اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ضلع صدر راؤ عبدالستار نے کہا کہ اردو اساتذہ ہر حال میں اردو کی تعلیم اسکولوں میں دیں، جس سے مستقبل میں اردو کا تحفظ کیا جاسکے۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری سید وجاہت شاہ نے کہا کہ ایسوسی ایشن اردو ٹیچرس کی بہبود اور اردو کے تحفظ کے لیے مسلسل کوشاں ہے، اردو کتابوں کی تقسیم، اردو قاعدے اور امتحان کے پرچوں کی اشاعت ایسوسی ایشن کی جانب سے پہلی بار کی گئی، جس کے بہتر نتائج سامنے آئے ہیں، انھوں نے کہا کہ 9 نومبر کو ''یوم اردو'' کا انعقاد بڑے پیمانے پر کیا جائے گا۔ میں سبھی اردو دوستوں اور اساتذہ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ ''یوم اردو'' 9 نومبر کے اس پروگرام میں شریک ہوں۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● سیتامڑھی۔ 16 اکتوبر، اردو کے فروغ اور ترقی کے نوجوانوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ اس خیال کا اظہار بہار پرائمری ٹیچرس یونین کے صدر ماسٹر راشد فہمی نے نمائندہ قومی تنظیم سے ایک ملاقات میں آج کیا۔ جناب ماسٹر راشد فہمی نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے جب تک مسلم نوجوان آگے نہیں آئیں گے تب تک اردو کی ترقی ممکن نہیں۔ اگر ہندوستان میں اردو زبان بچی ہوئی ہے تو وہ مدارس اسلامیہ کا دین ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنی مادری زبان کو بچانے کے لیے اردو پڑھیں، لکھیں اور اپنے بچوں کو بھی اردو پڑھائیں۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● پٹنہ۔ 21 اکتوبر، نیشنل اسٹوڈنٹس سوشل کلب بہار، پٹنہ نے ریاست میں اردو زبان کے مکمل نفاذ پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس معاملے میں سرکاری سطح پر ہی پہل کی جانی چاہیے۔ آج یہاں جاری بیان میں نشر و اشاعت کے سکریٹری شاہد انور نے بتایا کہ کلب نے چیف سکریٹری اور کمشنر کے نام مکتوب میں کہا ہے کہ پہلے یہ یقینی بنایا جائے کہ تمام افسران اپنے دفاتر میں اپنے نام کی پلیٹ اردو میں بھی لگوائیں اور یہ ہدایت ضلع سے بلاک سطح تک کے افسران کو دی جائے۔ کلب نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ پنچایت سطح تک اردو کی درس و تدریس کا نظم کیا جائے اور جن اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی جگہ برسوں سے خالی پڑی ہے وہاں اردو ٹیچر کا نظم کیا جائے۔ شاہد انور نے انٹرمیڈیٹ میں 50 نمبر کی اردو بہ حیثیت لازمی سبجیکٹ پڑھائے جانے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے لیے محبان اردو اور ان اراکین قانون سازیہ کو مبارکباد دی جن کی کوششوں کی وجہ سے یہ ممکن ہوسکا۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● میسور۔ ایف ٹی ٹی آئی میسور کی بزم اردو کی جانب سے 13 اگست کو ''یوم اردو'' منایا گیا جس کی پہلی نشست میں طالبہ روشن بیگم نے قرأت، حسینہ نے حمد اور بی بی عرشیہ نے نعت سنائی۔ بزم کی سکریٹری عظمیٰ شکیل نے استقبالیہ تقریر کی اور مہمان خصوصی کا تعارف اور صدر جلسہ پروفیسر ریاض احمد صاحب کی خدمات کا اظہار کیا۔ احمد ممتاز صاحب نے پروفیسر محمد جعفر صادق مہمان خصوصی کی گلپوشی کی طالبہ روشن بیگم نے غزل سنائی اور بزم اردو کی روداد پیش کی۔ مہمان خصوصی نے بتایا کہ اردو کے بہت سے لفظ آج بھی مقامی زبان کنڑ میں مستعمل ہیں ہمیں دونوں زبانوں کو سیکھنا اور فروغ دینا چاہیے۔ عبداللہ شریف سردار صاحب ٹرسٹی نے بھی اسی پر زور دیا۔ طالبہ حسینہ نے ایک اور غزل پیش کی اور نازیہ بانو نے مزاح نگار فرحت اللہ بیگ پر مقالہ پیش کیا۔ صدر جلسہ نے کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب کی ترجمان ہے اور ہمارے دین کا سرمایہ بھی اسی میں ہے اس لیے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ طالبہ مصباح کے اظہار تشکر کے بعد پہلی نشست اختتام کو پہنچی۔ دوسری نشست کی صدارت جناب گوہر تریکیروی نے کی، محترمہ مصباح نے قرأت پیش کی اور محترمہ نجمہ لائبریرین نے نعت سنائی۔ بزم کی سکریٹری نے استقبالیہ تقریر میں مہمان خصوصی کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد شعری نشست کے صدر نشیں گوہر صاحب تھے اور سید احمد راحل صاحب نے نظامت کی۔ شعرا میں جناب رزاق افسر،

ڈاکٹر عرفان ریاض، رفیق عارف صاحب، خطیب صاحب، مشتاق سعید صاحب اور اثر سعید صاحب نے اپنا کلام سنایا جس سے سامعین محظوظ ہوئے۔

(سالار، بنگلور)

● حیدرآباد۔ 5 ستمبر، بیشتر مفکرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کے مقاصد میں نفس کی تربیت کے ساتھ سماج کی تربیت اور اصلاح بھی شامل ہیں۔ تعلیم کو برائے تعلیم نہیں بلکہ تعلیم برائے زندگی ہونا چاہیے اور جب علم کا اور تعلیم کا مقصد اجتماعی زندگی کی اصلاح بھی ہے تو ان نظریات کا جاننا بھی ضروری ہوجاتا ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کو متاثر کرتے رہے ہیں اور عصر حاضر میں تہذیب کی تشکیل جدید میں جن کا نمایاں حصہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محسن عثمانی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں چوتھا یوم اساتذہ لکچر دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کے اساتذہ، اعلیٰ عہدیداروں اور طلبہ کے اجتماع سے ''ہردم متغیر تھے خرد کے نظریات'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے صدارت کی۔ پروفیسر محسن عثمانی نے جو انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی (حیدرآباد) کے اسکول آف فارن لینگویجز میں ڈین رہ چکے ہیں اور جنھیں حال ہی میں عربی تدریس کے شعبے میں نمایاں خدمات پر صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ طالب علم کے علم وفکر کے چراغ کو جلانے کا کام اور اس کے اندر بصیرت پیدا کرنے کا کام استاد ہی کا ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فاؤنڈیشن لکچر سیریز کے تحت یوم اساتذہ کا یہ چوتھا لکچر تھا۔ پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے ابتدا میں یوم اساتذہ کی اہمیت اور اردو یونیورسٹی کے دس سالہ سفر کی مختصر روداد پیش کی۔ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر محسن عثمانی کا تعارف پیش کیا اور انھیں یادگار تحفہ نذر کیا۔

(منصف، حیدرآباد)

● الٰہ آباد۔ 18 اکتوبر، ادبی و لسانی تنظیم اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اترپردیش کی وزیراعلیٰ مایاوتی کے ذریعے اردو سے متعلق کیے گئے اعلانات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ تنظیم نے سوال کیا ہے کہ اگر اترپردیش حکومت اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتی ہے تو بی ٹی سی اردو ٹریننگ میں غیرمسلموں کو داخلہ کیوں دیا جارہا ہے؟ اور اردو اکادمی، محکمۂ اقلیتی بہبود، اترپردیش اقلیتی کمیشن اور وقف بورڈ کے دفاتر میں غیرمسلموں کو ملازمت کیوں دی جارہی ہے؟ ان تمام دفاتر میں کام کی زبان اردو ہونی چاہیے اور گروپ سی وڈی ملازمین کی تقرری کے لیے اردو کا علم لازمی ہونا چاہیے مگر حکومت نے آج تک ایسا نہیں کیا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے کہا کہ ریاست کے بعض علما نے وزیراعلیٰ مایاوتی کے ساتھ تصویر کھنچوا کر ہندوستان کے مسلم اردو داں عوام کو گمراہ کیا ہے کیونکہ اترپردیش حکومت نے ''اردو ٹیچر'' کی پوسٹ ختم کرکے ''اسسٹنٹ ٹیچر'' کردیا ہے۔ تنظیم نے اترپردیش حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنے عدالتی حلف ناموں پر قائم رہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 4 نومبر، بزم ادب کے زیراہتمام ذاکر حسین کالج کے شعبۂ اردو میں ایک خصوصی خطبہ بعنوان ''سرسید پیش رو اقبال'' کا انعقاد کیا گیا۔ جو مہمان خصوصی پروفیسر عبدالحق نے پیش کیا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر اسلم پرویز نے کی جبکہ ڈاکٹر خالد علوی نے مہمان خصوصی پروفیسر عبدالحق کا تعارف کرایا۔ پروفیسر عبدالحق نے ذاکر حسین کالج میں خطبہ پیش کرنے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کالج ہمارے لیے مقام محمود کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید مجدد کا درجہ رکھتے تھے اور غالب، سرسید، شبلی و اقبال کے بعد کوئی اور شخصیت ایسی نظر نہیں آتی، انھوں نے کہا کہ سرسید نے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر اپنی جرأت کا اظہار کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کے متعلق کہا کہ کوئی بڑا شاعر اقبال کے بغیر بڑا نہیں ہوسکتا۔ پروگرام میں شعبۂ اردو کے اساتذہ، ڈاکٹر جعفر احراری، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر احمد خاں، ستیش کمار اور ڈاکٹر محمد عالم کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ اور طالبات نے شرکت کی۔ آخر میں ڈاکٹر احمد خاں نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● مرادآباد۔ 8 اکتوبر، منشی پریم چند کی 72ویں برسی کے موقعے پر کیف وقمر لائبریری کی جانب سے شمسی پبلک اسکول میں ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا جس میں منشی پریم چند کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ عبدالحمید شمسی نے کہا کہ منشی پریم چند نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا پھر وہ کہانیاں لکھنے لگے ان کی کہانیاں عام آدمی کی زندگی پر نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ہندوستان کے ہی نہیں عالمی سطح کے مصنف تھے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کل تعلیمی اداروں میں ان ادبی شخصیات کو یاد نہیں کیا جاتا جنھوں نے آنے والی نسلوں کی ذہنی رہنمائی کی اور ہندوستان کو ادب میں بلند مقام عطا کیا۔ شکیل انوار صدیقی، ڈاکٹر الیاس، ندیم راعی، ڈاکٹر زیبا ناز، نسیم ساغر شمسی، خلیل احمد خلش، سید ہاشم علی، راحت زماں خاں اور معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور منشی پریم چند کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس ادبی نشست کی صدارت انور عالم لطیفی نے کی۔ نظامت کے فرائض محمد اویس شمسی نے انجام دیے۔

(ڈاک سے)

● گورکھپور۔ 8 اکتوبر، گزشتہ دنوں "انجمن محبان فروغ اردو" گورکھپور کی تیرھویں ماہانہ نشست ناصر لائبریری میں ہوئی جس کی صدارت شاہد رضا ساجد نے کی۔ نظامت کے فرائض روشن صدیقی اور راز اعظمی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ شعرا میں مقبول حسن لاری، راز اعظمی، بہا گورکھپوری، خمار گورکھپوری، شاکر علی اور روہت سریواستو تھے۔

دوسرے دور میں جواہر نوودے ودیالیہ داخلہ امتحان 2009 میں طلبہ کی کامیابی کو یقینی بنانے کی غرض سے مفت کوچنگ کا نظم ناصر لائبریری ابو بازار میں ہونا طے پایا۔ یہ کلاس ہر اتوار کو ہوگی اور یہ سلسلہ یکم فروری تک چلے گا۔ علمی تعاون کے لیے ریٹائرڈ سیلس ٹیکس کمشنر محمد یعقوب فاروقی، انجینئر سید مشتاق احمد، انجینئر محمد پرویز صدیقی، ڈاکٹر مظہر عباس، ڈاکٹر نفیس احمد رضوی، محمد اعظم اور علیم کوثر نے یقین دلایا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

نہ تھک کے بیٹھ کہ تیری اڑان باقی ہے
زمین ختم ہوئی آسمان باقی ہے
شان الرحمٰن

● گیا۔ 19 اکتوبر، بزم قلم کار گیا کی سلور جوبلی کے موقعے پر مدرسہ انوار العلوم معروف گنج، گیا میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کوی سمیلن کا انعقاد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت پنڈت آنند موہن گلزار زتشی دہلوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پنڈت آنند موہن گلزار زتشی دہلوی نے کہا کہ اردو ہماری وراثت ہے اور ملک کی امانت ہے۔ انھوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اردو رسم الخط ضرور سیکھیں اور اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائیں۔ اس موقعے پر جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، وہ تھے، پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی، حسن نواب حسن، نسیم عزیزی، منظر سلطان، نعیم الدین نعیم، خورشید گوہر، سنیل کمار تنگ، ارشاد آرزو، ملک زادہ جاوید، جاوید اختر ملۂ آبادی، شان الرحمٰن، اقبال اشعر، خورشید اکبر، راحت اندوری، رخسانہ صدیقی، اسرار جامعی، نثار خان، ریحانہ نواب، ڈاکٹر لطف الرحمٰن۔ اس موقعے پر این۔بی۔ پی۔ یو۔ ایل۔ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، ممبر آف اسمبلی نہال الدین، کمشنر مگدھ کے پی رمیا، ضلع مجسٹریٹ سنجے کمار سنگھ، جمیل منظر، نگر نگم کمشنر رائے مدن کشور، پروفیسر علیم اللہ حالی، ایڈوکیٹ مسعود منظر، ڈاکٹر فراست حسین، غلام صمدانی، ایڈوکیٹ قیصر شرف الدین، خواجہ زاہد قاسمی، موتی کریمی، ڈپٹی میئر موہن شریواستو، آفاق اختر، شمیم اختر، سید احمد قادری کے علاوہ کئی لوگ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

قیامت دوستو سر پر کھڑی ہے
یہی دراصل جینے کی گھڑی ہے
اسلم پرویز

● دہلی۔ 10 اکتوبر، اردو اکادمی دہلی کی جانب سے "عالمی یوم اساتذہ" کے موقعے پر درس و تدریس سے وابستہ شعرا کا مشاعرہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ جامعہ صرف تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی و ثقافتی مرکز بھی ہے اس لیے ہماری خواہش ہوتی ہے کہ یہاں اس طرح کے پروگرام منعقد کیے جائیں جو اردو تہذیب و ثقافت کو اجاگر کریں۔ انھوں نے اکادمی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے درس و تدریس سے وابستہ شعرا کے اجتماع کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا انتخاب کیا۔ مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز قانون داں اور قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین پروفیسر طاہر محمود نے اپنے شگفتہ انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ادبا اور شعرا نے اس ملک کی آزادی کے لیے جو رول ادا کیا تھا وہ ناقابل فراموش ہے۔ آج کی اس مکدر فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے بھی ادبا اور شعرا کو آگے آنا چاہیے کیونکہ قلم میں جو طاقت ہے وہ کسی بھی ہتھیار میں نہیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اساتذہ کو ان کے فرائض یاد دلائے اور کہا کہ اساتذہ معاشرے کے معمار ہوتے ہیں ان کی سنجیدگی سے ایک صحت مند معاشرہ جنم لیتا ہے۔ مرغوب حیدر عابدی سکریٹری اردو اکادمی نے شکریے کا فریضہ انجام دیا۔

مشاعرہ کی نظامت کے فرائض معروف شاعر جناب اعجاز انصاری نے انجام دیے۔ شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:

مظفر حنفی، لطف الرحمٰن، وسیم بریلوی، اسلم پرویز، دھرمیندر ناتھ، عتیق اللہ، صادق، ناشر نقوی، عارف عثمانی، سہیل احمد فاروقی، فرحت شہزاد (امریکا)، شہپر رسول، خالد محمود، کوثر مظہری، مولا بخش اسیر، نگار عظیم، ڈاکٹر نیر جلالپوری، اعجاز انصاری، سلمیٰ شاہین، شعیب رضا فاطمی، جی آر کنول، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ڈاکٹر عفت زریں، سہیل صدیقی، ریاضت علی شائق۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

منظروں کی گواہی نہیں معتبر
اعتبارِ نظر اٹھ چکا ہے میاں
مخمور سعیدی

● نئی دہلی۔ 4 نومبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے تعلیمی میلے میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام "جامعہ کا مشاعرہ" منعقد کیا گیا جس کی صدارت مخمور سعیدی نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔ مخمور سعیدی اور معین شاداب کے علاوہ ان شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

شیث محمد اسماعیل اعظمی، سہیل صدیقی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر شہپر رسول، سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر احمد محفوظ، فرحت احساس، فریاد آزر، سلمیٰ شاہین، نعمان شوق، پروفیسر عراق رضا زیدی، عارف نقوی، پروفیسر خالد محمود، معین شاداب، رحمان مصور، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، عمیر منظر، اسرار جامعی، یوسف پاپا، غفران قدوائی، خوشبو، سکینہ اور سریش سپن۔ مشاعرے کے کنوینر پروفیسر خالد محمود نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کلمات تشکر پیش کیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہم اپنی تاریخ تولتے ہیں تم اپنے اوہام بیچتے ہو
ہمارا سرمایہ نقد ہوگا تمھارا سودا ادھار ہوگا

عبدالاحد ساز

● نئی دہلی۔ 11 نومبر، انٹرلینھ کولیشن فارمیس اور گاڈس گریس تعلیمی اداروں کے گروپ کے زیر اہتمام جشن اقبال کے آخری دن کل ہند طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے اور نظامت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے حاضرین اور شعرا کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ ڈاکٹر سید ظفر محمود نے سیمینار کے ساتھ اقبال کے مصرعوں پر کل ہند طرحی مشاعرے کا انعقاد کرکے شاعروں کو علامہ کے افکار عالیہ سے استفادے اور انھیں خراج تحسین کا ایک اہم موقع فراہم کیا ہے۔ ڈاکٹر سید ظفر محمود نے تمام حاضرین، مقالہ نگاروں، شاعروں اور سامعین کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے سے قبل گاڈس گریس کے بچوں نے اقبال کی نظم جگنو اور تارے کا ایکشن پلے بھی کیا۔ شریک شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:

عبدالاحد ساز، سردار پنچھی، مخمور سعیدی، متین امروہوی، ڈاکٹر تابش مہدی، ذکی طارق، چندر بھان خیال، حسن کاظمی، قیصر شمیم، فرید پربتی، نسیم عباسی، معین شاداب، عفت زریں، کمال جعفری، ڈاکٹر کوثر مظہری، زاہدہ زیدی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کیوں مجھے خوف سے تو دیکھ رہی ہے دنیا
کیا مرے پاس سے بارود کی بو آتی ہے

منور رانا

● نئی دہلی۔ 21 اکتوبر، غالب اکیڈمی میں آج ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مشہور شاعر منور رانا نے کی۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنی تقریر میں کہا کہ جنوبی ہند خاص طور سے کرناٹک اور آندھرا پردیش میں اردو کا شاندار مستقبل ہے اور اردو کے لیے اچھا ماحول ہے۔ اردو کی سب سے بہتر صورت حال مہاراشٹر میں ہے۔ جہاں اردو کی تعلیم کا بہتر بندوبست کیا گیا ہے۔ شمالی ہند میں اردو کی تعلیم کا اچھا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے یہاں اردو کا ماحول نہیں ہے۔ اس موقعے پر سکریٹری غالب اکیڈمی ڈاکٹر عقیل احمد نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ مشاعروں کی وجہ سے اردو زبان ہندوستان ہی نہیں دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیل چکی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے بھی اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ٹی وی پر مشاعروں کو کوریج ملنے کی وجہ سے اردو کے اشعار جب لوگوں کے کانوں میں پڑتے ہیں تو اس زبان کی شیرینی سامع کو اپنی جانب راغب کرلیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں اردو کی تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

اس نشست میں لکھنؤ سے طارق قمر، کولکاتا سے ضمیر یوسف نے شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔ نسیم عباسی اور متین امروہوی نے بھی کلام سنایا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہمارے بچے غموں سے ہیں بے نیاز ابھی
ابھی یہ مورچہ ہم نے سنبھال رکھا ہے

نظمی سکندرآبادی

● نئی دہلی۔ 13 اکتوبر، شمالی گھونڈہ میں واقع الفلاح اسلامک اسکول میں عید اور دسہرہ ملن تقریب کے تحت ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب اے۔ آر۔ نے کی جب کہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔

تقریب کا اہتمام آصف نظر کی جانب سے کیا گیا تھا۔ شہزاد احمد مشاعرہ کے مہمان خصوصی تھے۔ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا:

نظمی سکندرآبادی، فصیح اکمل، طالب رام پوری، انقلاب سرسوی، معین شاداب، آصف نظر مظفر نگری، عقیل نہٹوری، سویتا اسیم، ہما مظفر، عارف خان پوری، علی رضا عادیل سانکھوی، ماسٹر نثار احمد، عارف نجوڑوی، بدرالدین صارم اور نثار دہلوی وغیرہ۔

چاند بھی حیران، دریا بھی پریشانی میں ہے
عکس کس کا ہے کہ اتنی روشنی پانی میں ہے

فرحت احساس

● نئی دہلی۔ 12 اکتوبر، نوئیڈا اسیکٹر 93 کے باشندوں نے دسہرہ اور عید ملن تقریبات کے اہم موقعے پر ایک مشاعرے کا انعقاد کیا، جس میں بطور مہمان خصوصی جسٹس سید ناظم حسین زیدی نے شرکت کی اور پروانچل سلورسٹی کنسٹرکشن ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ کے چیئرمین شاہ عالم نے شمع روشن کرکے افتتاح کیا۔ مسٹر ایس کے گوئل نے صدارت کی۔ طالب زیدی نے نظامت

کے فرائض انجام دیے۔محترمہ مہرالنساء نے مہمانوں کی خدمت میں گلدستے پیش کرکے ان کا استقبال کیا۔شعرا تھے:

فرحت احساس، کوثر مظہری، شکیل شمیم، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، طالب زیدی، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، نعمان شوق، ڈاکٹر مشتاق صدف، دکشت دنکوری، شرف نانپاروی، ڈاکٹر حسین ماجد، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، محترمہ نایاب زہرہ زیدی، احمد علوی، انوار رضوی، مسٹر مخیش، محترمہ سیتا بدھی راجہ اور محترمہ ششی گوئل۔
شام 8 بجے سے رات ایک بجے تک مشاعرہ جاری رہا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

فقیرانہ طبیعت ہے کہاں بستر، کہاں چادر
ہوئی جب رات تو ہاتھوں کو تکیہ کرلیا میں نے
اثر فریدی

● پٹنہ۔ اکتوبر، علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام یوم سرسید کے موقعے پر سبزی باغ میں ایک خصوصی ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ محفل کی صدارت شان الرحمٰن نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے انجام دیے۔ شرکائے محفل نے سرسید کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں نے اگر مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب نہ کیا ہوتا تو آج مسلمانوں کے تعلیمی اور سماجی حالات اور بھی ابتر ہوتے۔ آج کے دور میں بھی سرسید جیسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے۔ بعدازاں جھارکھنڈ سے عظیم آباد تشریف لائے معروف شاعر رونق شہری کے اعزاز میں مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا نے کلام سنایا: محمد اسلم پرویز اسلم، نسیم احمد نسیم، اثر فریدی، فردوس گیاوی، خورشید اکبر، اشرف یعقوبی، رونق شہری، شان الرحمٰن۔ اخیر میں صدر کے کلام اور خطبے کے بعد علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے تمام شعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے بہت کم وقت میں ایک خوبصورت محفل کے انعقاد میں تعاون کیا۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

اسے غرور کہ وہ مجھ کو جیت سکتا ہے
مجھے یہ شوق کہ میں خود کو ہارتا دیکھوں
نوشاد احمد کریمی

● بتیا۔ 14 اکتوبر، قومی یک جہتی اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں صابر اکادمی کی جانب سے بتیا میں 14 اکتوبر کی شام ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر اور افسانہ نگار جناب شاکر کریمی نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب محمد مختار وفا اور کشوری لال انشومالی تھے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ مشاعرے کی جتنی مضبوط روایت اردو زبان میں ہے، وہ دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرہ ایک ایسا ادارہ ہے جس سے ذہن سازی اور شعروشاعری کی ترویج وترقی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ ہم سب کو مل کر مشاعرے کی شاندار تہذیبی روایت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے انجام دیے۔ شریک شعرا تھے:

شاکر کریمی، محمد مختار وفا، منظر سلطان، ابوالخیر نشتر، نوشاد احمد کریمی، ظفر امام، ذاکر حسین ذاکر، اختر حسین اختر، سریش گپت، شمیم افضل، مرزا کھونچ اور افتخار وصی کریک۔ (ڈاک سے)

سیاست میں تعصب کی ہوئی ہے جب سے آمیزش
ہمیں پر ظلم ہوتا ہے، ہمارے گھر ہی جلتے ہیں
مشرف حسین

● متھرا۔ بزمِ شہدائے ادب متھرا کے زیر اہتمام 79 ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی سرپرستی جناب بابو لیٰسین خاں شفائی نے فرمائی اور صدارت ڈاکٹر ظہیر حسن ڈی لٹ نے فرمائی۔ شمع افروزی برج بھاشا کے کوی مست چترویدی نے کی۔ نظامت کے فرائض سید محمد حسین اختر متھراوی نے انجام دیے۔ بحیثیت مہمانِ خصوصی مرزا حاجی بشیر بیگ اور ڈاکٹر این.اے. خان نے شرکت کی۔ سابق وزیر تعلیم مسٹر شیام سندر شرما نے شرکت فرما کر مشاعرہ کے وقار میں اضافہ فرمایا۔ بانی بزم سعید اعظمی نے مہمانان کی گلپوشی فرما کر استقبال کیا۔ مشاعرے کا آغاز دلشاد متھراوی نے نعتِ پاک سے کیا۔ بزم کی جانب سے مسٹر شیام سندر شرما کو قرآن کریم کا ہندی نسخہ نذر کیا گیا جس کو انھوں نے بڑی عقیدت و احترام سے قبول کیا۔ مشاعرے میں مندرجۂ ذیل شعرا نے کلام سنایا:

بابو لیٰسین خاں شفائی، ثمر کوسوی، غالب سنبھلی، ڈاکٹر ظہیر حسن، حسرت صفی پوری، ایم.اے. ثاقب، سعید اعظمی، بشر صہبائی، صوفی جمال کابری، محمد احمد خاں تابش، قمر اکبرآبادی، ضمیر باپوڑی، چھٹن خاں ساحل، شمیم متھراوی، اسلام متھراوی، نصرت شفائی، مست چترویدی، بھگوان داس آزاد، مشرف حسین محضر، ساحو تلہری، اثر ایوبی بجنوری، جالب سیفی، شرر حسن پوری، محمد صدیق راز، رونق کوسوی، کلیم تلہری اور اختر متھراوی۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

"متاعِ اقبال"

● حیدرآباد۔ 25 اگست، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ڈاکٹر عقیل ہاشمی سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی کتاب "متاعِ اقبال" کی رسم اجرا کی تقریب 23 اگست کی شام محمود بن محمد کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ کتاب کی رسم اجرا بدست جسٹس محمد سردار علی خاں

سابق جج آندھرا پردیش ہائی کورٹ عمل میں آئی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا رحیم الدین انصاری چیئرمین اردو اکادمی نے شرکت کی۔ محمود بن محمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع کردہ یہ 67ویں کتاب ہے اور علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیت پر شائع ہونے والی ادارے کی طرف سے پہلی کتاب ہے جس میں ڈاکٹر عقیل ہاشمی کے تحریر کردہ علامہ اقبال پر مضامین و مقالا جات کو شامل کیا گیا ہے۔ کمال الدین علی خاں معتمد ادارہ نے خیرمقدم کیا۔ جسٹس سردار علی خاں نے کہا کہ علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا کیونکہ علامہ اقبال کا کلام ہر دور میں حالات کی مناسبت سے رہبری و رہنمائی کرتا ہے۔ پروفیسر مجید بیدار نے کہا کہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی کی کتاب میں شامل مقالہ جات سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر ہاشمی، علامہ اقبال کے کلام سے کس قدر آگہی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے کہا کہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور ادارہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دونوں قابل مبارکباد ہیں کہ اس کتاب کو منظر عام پر لائے ہیں۔ مولانا رحیم الدین انصاری نے کہا کہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نہ صرف ایک اچھے نثر نگار اور ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ وہ ایک اچھے انسان بھی ہیں جنھوں نے اپنے قلم اور اخلاق و کردار سے ہر ایک کو متاثر کیا ہے۔ ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکادمی نے متاع اقبال پر تفصیلی روشنی ڈالی اور جلال عارف نے تہنیتی قطعات پیش کیے۔ (منصف، حیدرآباد)

''مضامینِ سعادت''

● رام پور۔ 3 نومبر، ''مضامین سعادت'' سعادت اللہ خاں رامپوری کے مضامین کا مجموعہ ہے، اسے رام پور رضا لائبریری نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ 27 مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ سعادت اللہ خاں کے افسانوں اور مختلف اوقات میں آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے نشر شدہ ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مختلف النوع مضامین میں قابل ذکر'' اردو زبان و ادب کے فروغ میں نوابین رام پور کا حصہ''، ''کیا دہشت گردی جہاد ہے؟''، ''مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا''، ''رام پور کی لغت'' کے علاوہ منے میاں صابر، شاد عارفی، محشر عنایتی، پیارے خاں وفا اور نور میاں ضیا مجددی پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں رضا لائبریری کے افسر بکار خاص و سابق ڈائرکٹر آثار قدیمہ حکومت ہند ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی نے مضامین کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ سعادت اللہ خاں کے اسلوب بیان کی تعریف کی ہے۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

''تنقیدیں اور تبصرے''

● سنبھل۔ 24 اکتوبر، ڈاکٹر منور تابش کے مجموعۂ مضامین ''تنقیدیں اور تبصرے'' کی رسم اجرا میں مقامی و بیرونی شعرا و ادبا نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت ہندو کالج مرادآباد کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عارف حسن خاں نے کی جبکہ نظامت کا فریضہ شاہ حسین عارف نے انجام دیا۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر عارف حسن کی گل پوشی سے کیا گیا۔ اپنے خطبۂ استقبالیہ میں سنبھل ایم جی ایم کالج کے سربراہ شعبۂ اردو ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے کہا کہ نئی نسل کو دوسری زبانوں کی طرح ہی اردو پڑھنی اور لکھنی چاہیے آج ہم اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کے لیے تو کوشش کرتے ہیں مگر اردو کے لیے اتنے سنجیدہ نہیں ہیں جتنا ہمیں ہونا چاہیے۔ ترقی کے اس دور میں اگر ہم لوگ اردو کی بقا کے لیے سرگرم نہ ہوئے تو اردو اپنے ہی گھر میں دم توڑ دے گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی حالت دکن میں اس لیے بہتر ہے کہ وہاں کے لوگ اردو زبان کو بھی دوسری زبانوں کے برابر سمجھتے ہیں۔ میری نئی نسل کے ادبا اور شعرا اور نقادوں سے گزارش ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو پڑھنے والوں کی جماعت تیار کریں۔ ڈاکٹر حسیم الظفر باقری نے کہا کہ اردو کی جو تعلیم ہمارے بچوں کو گھروں میں ملتی تھی اب اس میں تبدیلی آئی ہے۔ اب اس کی جگہ دوسرے مضامین نے لے لی ہے۔ ہمارے بچے حساب اور سائنس میں تو آگے ہیں مگر اردو میں پچھڑ رہے ہیں لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے اسکولوں کے علاوہ بھی اپنے بچوں کو گھروں میں اردو سے آراستہ کریں۔ اردو سے ہمارا مذہبی رشتہ بھی ہے۔ سوچیے کہ اگر ہمارے بچے اردو نہ پڑھ سکے تو وہ کس طرح اپنے مذہب کی خدمت کرسکیں گے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں ڈاکٹر عارف حسن خاں نے کہا کہ ڈاکٹر منور تابش نے شاعر ہونے کے باوجود اپنا پہلا مجموعہ نثر میں لاکر سنبھل کی نئی نسل کو ایک نیا پیغام دیا ہے۔ اس تاریخی شہر کی ادبی تاریخ میں ''تنقیدیں اور تبصرے'' ایک نئے باب کا اضافہ کرے گی۔ اس سے ان کی اردو سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے اختتام پر مخصوص شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ (صحافت، نئی دہلی)

ماتم میں ہم شریک

پروفیسر نذیر احمد

● رام پور۔ 22 اکتوبر، فارسی کے محقق اور 50 سے زیادہ کتابوں کے مصنف سیکڑوں مضامین تحریر کرنے والے پدم شری نذیر احمد کے سانحۂ ارتحال پر آج رضا لائبریری میں تعزیتی میٹنگ لائبریری کے افسر بکار خاص ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی کی صدارت میں ہوئی جس میں فارسی کے مرحوم محقق کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی نے بتایا کہ پدم شری نذیر احمد دنیا کے ایسے واحد انسان تھے جنھوں نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا تھا کہ تاج محل کا

مکمل ڈیزائن استاد احمد لاہوری نے تیار کیا تھا اور تاج محل کی تعمیر ہونے معمار نے کی تھی جس کا نام تاج محل کے گنبد پر کندہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایران کی سلطنت کے دو ہزار سالہ جشن میں پدم شری نذیر احمد ہندوستان سے مہمان خصوصی تھے۔ مرحوم کو تاریخ پر مکمل عبور تھا جبکہ وہ فارسی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ پدم شری نذیر احمد کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔

گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج میں فارسی کے شعبہ انچارج ڈاکٹر محسن نے انھیں فارسی زبان و ادب کا محقق قرار دیا اور کہا کہ مرحوم کی خدمات کو حکومت ایران نے بے حد سراہا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے سابق ڈین شریف الرحمٰن خاں نے کہا کہ ایران کے تعلیمی اداروں میں جو سلیبس پڑھایا جاتا تھا اسے پروفیسر نذیر احمد نے ترتیب دیا تھا۔ مرحوم چلتی پھرتی لائبریری تھے اور تحقیق کے لیے ان کے پاس ہمت اور طاقت بہت تھی۔ گورنمنٹ گرلز پی جی کالج کے لیکچرر ڈاکٹر ارشد رضوی نے ان کی موت کو ادب اور علم کا بہت بڑا المیہ قرار دیا اور کہا کہ مرحوم کا خلا تو پورا نہیں کیا جاسکتا لیکن ہم کوشش کریں کہ فارسی کی طرف نوجوان نسل کا رجحان بڑھے۔

رضا لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے کہا کہ ہماری تہذیبی زبان فارسی ہے جس کو سمجھنے والے اب بہت کم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ رضا لائبریری نے مرحوم کی کئی کتابیں شائع کیں اور رضا لائبریری جرنل میں ان کے مضامین مسلسل شائع ہوتے تھے۔ پروفیسر نذیر احمد کو پروفیسر آفتاب شمسی، ڈاکٹر مہدی حسن، سعادت اللہ خاں، شفیق جیلانی سالک اور سید احمد میاں نے بھی اپنے اپنے انداز سے خراج عقیدت پیش کیا۔ تعزیتی جلسے کی نظامت ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شاعر جمالی

● نئی دہلی۔ 21 اکتوبر، مخصوص لب و لہجے کے مشہور و معروف شاعر، شاعر جمالی کا گزشتہ اتوار کی شب 10 بجے فیض آباد ریلوے اسٹیشن پر دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے آبائی وطن نان پارہ (بہرائچ) سے جون پور لوٹ رہے تھے جہاں وہ گزشتہ دو دہائیوں سے مقیم تھے۔ ان کی عمر 65 برس تھی۔ وہ 2000 میں میڈیکل آفیسر (جون پور) کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ سیکڑوں سوگواران کی موجودگی میں شاعر جمالی کو آج نان پارہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اپنے خاص شعری تیور سے شناخت قائم کرنے والے شاعر جمالی کی تین کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں سلام اور نوحوں کا مجموعہ ''کرب'' (1978) غزلوں کا مجموعہ ''صحیفہ'' (1982) اور ایک شعری مجموعہ ''لہجہ'' (1997) شامل ہیں۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے ''لہجہ'' پر 1999 میں انھیں اردو اکادمی ایوارڈ حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ پوروانچل رتن اور نذیر بنارسی ایوارڈ سمیت دیگر کئی اعزازات بھی پیش کیے گئے۔

شاعر جمالی کا اصل نام سید نذر الحسنین تھا۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا سید ظفر الحسنین اور تین بیٹیاں سید کہکشاں حسنین، سید درخشاں حسنین اور سید شاد ماں حسنین ہیں۔ شاعر جمالی کے بہت سے اشعار مقبول ہیں جن میں یہ اشعار بھی شامل ہیں۔

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے
شام ڈھلے ہر پنچھی کو گھر جانا پڑتا ہے
کون خوشی سے مرتا ہے، مرجانا پڑ جاتا ہے

عبدالنصیر خاں

● نئی دہلی۔ 7 نومبر، معروف صحافی اور دلی کی سماجی شخصیت عبدالنصیر خاں کا 6 نومبر کی صبح اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 86 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے ہیں۔ مرحوم کو اچانک سینے میں درد ہونے پر ہولی فیملی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ڈاکٹروں کی نگرانی میں ان کا علاج چل رہا تھا لیکن علاج کے دوران ہی انھیں دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم عبدالنصیر خاں طویل عرصے تک معروف اردو ماہ نامہ ''شمع'' سے وابستہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ سوویت روس کے سفارتخانہ کے کلچرل ونگ سے بھی کافی لمبے عرصے تک وابستہ رہے اور ''سوویت لینڈ'' اور ''سوویت دیش'' کے لیے کام کیا۔ مرحوم نے انجمن ترقی اردو ہند کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ انھیں 6 نومبر ہی کو نماز ظہر کے بعد بٹلہ ہاؤس قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

خالد عبداللہ

● مغربی بنگال کے کہنہ مشق شاعر خالق عبداللہ کا 6 نومبر کی صبح ہوڑہ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 62 سال تھی۔ پسماندگان میں بیوہ ہیں۔ جناب فہیم انور کی اطلاع کے مطابق خالق عبداللہ کی تدفین 6 نومبر کو ہی آندول قبرستان میں ہوئی۔ خالق عبداللہ تقریباً 40 سال سے شاعری کر رہے تھے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا ایک انتخاب ''بجھتی ہوئی شمع کا دھواں'' حال ہی میں شائع ہوا تھا، جس میں ان کا منتخب کلام شامل ہے۔ خالق عبداللہ کو بنگال کے اہم شعرا میں شمار کیا جاتا تھا۔

□□□

تبصرہ وتعارف

حیات جاوید

مصنف: الطاف حسین حالی
صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر.کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: شاہد الاسلام، G-79، کالندی کنج، سریتا وہار، مین روڈ، نئی دہلی-25

''حیات جاوید'' سرسید کی سوانح عمری ہے جسے ان کے رفیق کار الطاف حسین حالی نے ضبط تحریر میں لانے کے لیے بڑی محنت اور لگن سے کام لیا ہے اور صاحب سوانح کی زندگی سے متعلق مواد کی فراہمی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ مولانا حالی کی یہ وہ بیش بہا تحریر ہے جسے سرسید احمد خاں کی زندگی اور قومی خدمات کی تفسیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سرسید احمد خاں نے قوم کو سستی، کاہلی اور بے عملی جیسی بیماریوں سے نجات دلانے اور جہد مسلسل اور عمل پیہم کی ترغیب دلانے کے لیے جو کچھ کہا 907 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اسے بڑے ہی سلیقے اور قرینے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جلیل القدر شخصیت کی حیات و خدمات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ حالی نے اس محسن قوم کی گراں مایہ خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محنت، صبر، استقلال، غیرت، دلیری، اولوالعزمی، عالی حوصلگی اور تدبر و تفکر جیسے اوصاف حمیدہ سے سرسید کی انقلابی شخصیت پوری طرح متصف تھی اور قوم کے لیے ان کی ذات واجب التعظیم تو ہے ہی ساتھ ہی اسے سرچشمۂ رفیقاں کے طور پر بھی دیکھنا چاہیے۔

حالی درحقیقت خود بھی مصلحین قوم میں شامل ہیں جن کے احسانات تلے ہندوستانی قوم دبی ہوئی ہے اور شاید حق تو یہ بھی ہے کہ سرسید اور ان کے ساتھیوں کے کارناموں کے تذکرے کے بغیر ہندوستان کی تاریخ بھی نامکمل ہے۔ الطاف حسین حالی نے ناساعد حالات میں بھی خلوص دل سے سرسید کی ادبی و تعلیمی تحریکات کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی عملی کوشش کی۔

مورخین نے سرسید کے عہد کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ناساعد حالات میں قوم کی سربلندی کی خاطر سرسید احمد خاں کو ابتلا اور تکالیف کے کن کن حوصلہ شکن مرحلوں سے گزرنا پڑا اور خود ان کی ملت نے کس کس طرح انھیں مہتم کیا؟ پھر بھی وہ استقلال کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے اور ان کے عزائم مضمحل نہیں ہوئے۔

سرسید کی یہ سوانح عمری ان کی رحلت کے بعد منصۂ شہود پر آئی جس کا قلق خود حالی کو بھی تھا دیباچے میں حالی نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر شدید صدمے کا اظہار کیا ہے اور ان مخالفتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے سرسید اور ان کے رفقائے کار کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ سرسید کو کافر تک قرار دینے میں تامل نہیں کیا۔ حالی کو اس بات پر بے حد افسوس ہے کہ ''سرسید احمد خاں کی سوانح لکھنے میں ایک انگریز رائٹر سبقت لے گیا اور ان کی وفات سے 13 برسوں قبل کرنل گریہم نے باوجود غیر قوم کا ہونے کے ہمارے واجب التعظیم کی ایسی قدر کی اور ان کی بائیوگرافی کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی۔'' حالانکہ حالی کی یہ تمنا تھی کہ وہ سرسید کی زندگی کے حالات ان کے جیتے جی لکھیں۔ جب سرسید نے مدرستہ العلوم علی گڑھ (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی بنیاد ڈالی تھی تو اسی وقت حالی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس عظیم قائد کے حالات زندگی کو قلم بند کیا جانا چاہیے لیکن بعض اسباب وعلل کی بنا پر یہ کام ان کی زندگی میں انجام نہیں پاسکا۔ سرسید کی رحلت کے بعد ان کے دیگر رفقائے کار سے تفاصیل جمع کرنے کے بعد حالی نے ''حیات جاوید'' قلمبند کی جس میں سرسید کی فکر اور عمل کے ہر ایک پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ ''حیات جاوید'' کا یہ پانچواں ایڈیشن ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سلسلۂ مطبوعات 656 کے تحت شائع کیا ہے۔

''حیات جاوید'' کو سرسید کی ایک جامع اور مبسوط سوانح عمری کا درجہ حاصل ہے۔ 907 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مصنف نے بہ نظر سہولت دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے چھوٹے بڑے تمام واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے اور ان کے کام کے طریقوں پر از ابتدا تا آخر ترتیب وار روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں سرسید کی عملی زندگی کو موضوع بناتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام، تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور دیگر اہم تصنیفی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

''حیات جاوید'' کو پیش کرتے ہوئے حالی نے قاری کے لیے یہ سہولت رکھی ہے کہ سرسید کی زندگی کے کسی حصے سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے پوری کتاب پڑھنے کی ضرورت درپیش نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے کتاب کو دو حصوں میں منقسم تو کیا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ پہلے حصے کو چھ ابواب میں بھی بانٹ دیا ہے اور تاریخ وار ذیلی عنوان بھی قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں مصنف نے 1817 سے 1838 تک کی مدت کا احاطہ کیا ہے جس کے تحت سرسید کی پیدائش سے لے کر عنفوان شباب تک کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خاندانی پس منظر کو بھی پیش کیا گیا ہے اور تعلیمی سرگرمیوں کو بھی ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

دوسرا باب 1838 سے 1857 کے دور پر مشتمل ہے۔ حالانکہ اس باب کا آغاز سرسید کی ملازمت سے ہوا ہے لیکن سرسید کی شہرۂ آفاق کتاب "آثار الصنادید" نیز "آئین اکبری" کی تصحیح اور تقریظوں وغیرہ کو بھی اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ تیسرا باب اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ایام بغاوت کے خوں چکاں مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ باب 1857 سے 1868 تک کے دور پر مشتمل ہے۔ حالی نے کتاب کے اس حصے میں غدر کے احوال کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے کئی عنوان قائم کیے ہیں۔ مثلاً "ایام غدر کے مصائب اور خدمات" اور "خدمات غدر کا صلہ اور تعلقات چاند پور وغیرہ۔ اسی باب میں مولانا عالم علی مرادآبادی کے بغاوت کے الزام سے بری ہونے کے واقعے کو بھی سپرد قلم کیا گیا ہے۔ مرادآباد میں اسکول کے قیام، رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کی تصنیف، ملکۂ معظمہ کے اشتہار، معافی کے شکریے، لاوارث بچوں کی بابت مشنریوں سے جھگڑے، سائنٹفک سوسائٹی کے قیام، غازی پور میں مدرسے کی بنیاد، برٹش انڈ ایسوسی ایشن کی تشکیل، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کی بنا جیسے اہم واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اسی حصے میں سوسائٹی سے اخبار شائع کرنے کا تذکرہ بھی ہے۔ "حیات جاوید" کا چوتھا باب 1869 سے 1870 پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں سرسید کے بیرونی اسفار اور دیار غیر میں ان کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے جو سفر انگلستان اور سفر عرب کے احوال پر مشتمل ہے۔ سرسید کے یہ اسفار درحقیقت ملک میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے کے حوالے سے خاصے اہم ہیں کیونکہ سرسید نے برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران بہ نظر غائر فرنگیوں کی ترقی کے اسباب وعوامل کا جائزہ لیا اور غور وفکر کے بعد اس طرز تعلیم کے محاسن ومعائب کے حوالے سے معنی خیز نتیجے اخذ کیے اور پھر ہندوستان واپس آکر نئی فکر کا دیا روشن کرنے کی ٹھانی۔ حالانکہ سرسید نے برطانوی طرز تعلیم کے نقائص پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا اور اپنے فکر انگیز مضامین کے ذریعے دیار غیر سے بھی قوم کی رہنمائی کی۔ حالی نے ان تمام واقعات کو پیش کرتے ہوئے تنقیدی نگاہ سے بھی ہر واقعے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور جہاں ضرورت سمجھی ہے، سرسید کی فکر کی وضاحت وصراحت سے بھی کام لیا ہے۔ اس باب میں "خطبات احمدیہ" کی تصنیف کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔ کتاب کا پانچواں باب سرسید 1870 سے 1878 تک کی زندگی پر محیط ہے جس میں وطن واپسی کے بعد قوم کو جمود سے بیدار کرنے کی کوششوں کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ حالی نے یہ یاد دلایا ہے کہ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے سرسید نے اسی دور میں قوم کی فکری اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اور اپنے ناصحانہ مضامین کی وساطت سے بالخصوص مسلمانان ہند کو دعوت بیداری دی تھی۔ مگر جسے کتاب کا ماحصل یا حیات سرسید کا ماحصل کہا جائے وہ بھی کتاب کے اسی حصے کی زینت بنا ہے۔ میری مراد مدرسۃ العلوم کے قیام سے ہے جو سرسید کے اس خواب کی تعبیر ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی قوم کو جدید علوم وفنون سے آراستہ کرنے کے ایک جدید تعلیمی ادارے کے قیام کو ناگزیر تصور کیا تھا۔ حالی نے کالج کے قیام اور تدریسی سرگرمیوں سے لے کر تعمیراتی امور تک کو مرحلہ وار بیان کیا ہے اس سلسلے میں سرسید کو درپیش مسائل اور ان سے نپٹنے کے طریقوں کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ سرسید نے اپنے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے کیسی کیسی مشقتیں جھیلیں اور کن کن صعوبتوں سے انھیں گزرنا پڑا، حالی نے ایک ایک واقعے کو پیش کرتے ہوئے آنے والی نسلوں کے لیے سرسید کی خدمات سے آگہی کی اچھی سبیل فراہم کرائی ہے۔

چھٹا باب 1878 سے 1898 تک کے حالات پر مشتمل ہے جس میں علی گڑھ تحریک کی کامیابی کے بعد سرسید پر کیے جانے والے اعتراضات، غبن کے الزامات اور ان کی وفات کا ذکر ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں سرسید کی فکر اور عمل پر بحث کی گئی ہے یہ حصہ پہلے حصے کے مقابلے میں اس لیے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس میں مذہبی معاملات میں سرسید کے موقف کو واضح کیا گیا ہے۔ سرسید کے زمانے میں ہندوستان میں اسلام کو کن خطرات کا سامنا تھا اور ان سے مقابلے کے لیے سرسید کی ترجیحات کیا تھیں، حالی نے بڑے ہی مدلل انداز میں اس پر گفتگو کی ہے۔ حالی نے اس امر کے اعتراف کے باوجود کہ وہ سرسید کے کام کو ناقدانہ نظر سے دیکھنے میں یقین رکھتے ہیں، سرسید کی خامیوں کی پردہ پوشی بھی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "حیات جاوید" کو پڑھتے ہوئے بعض مقامات پر یہ گمان گزرتا ہے کہ حالی محض سرسید کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس کے باوجود اس ضخیم اور مبسوط سوانح عمری کو "مدلل مداحی" یا "کتاب المناقب" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ شبلی کہہ گئے ہیں کیونکہ آج بھی ہماری ملت کو سرسید ثانی کا شدت سے انتظار ہے جو لفظوں کی جگہ فکر وعمل کا جہاں آباد کرسکے۔

"حیات جاوید" کے اس ایڈیشن کی قیمت صرف 181 روپے ہے جسے ضخامت کے لحاظ سے کم ہی کہا جائے گا۔ طباعت مناسب ہے۔

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

ترتیب وتدوین: پروفیسر نصیر احمد خاں

صفحات: 3268، قیمت: -/1640 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: احمد کفیل، 28 ہولا برام پترا ہاسٹل، جے. این. یو.، نئی دہلی-110067

پروفیسر نصیر احمد خاں کی یہ لغت "جدید — ہندی اردو لغت" ذولسانی لغت ہے جس میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ، تلفظات اور معانی ومفاہیم

ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں دیے گئے ہیں۔ آج کے دور میں جب اردو ہندی لسانی و ادبی اشتراک اور رشتوں کی بازیافت کے لیے سیمینار، ورک شاپ اور یونیورسٹیوں میں تحقیقی زاویے تیار کیے جارہے ہیں ایسی لغت کی ضرورت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ ہندی نے سنسکرت سے فیضان حاصل کیا اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی و فارسی سے استفادہ کرتی رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں میں جتنی مماثلت ہے شاید دنیا کی کسی اور دو زبانوں کے بیچ نہیں اصل کے اعتبار سے یہ دونوں زبانیں ایک ہیں لیکن رسم الخط، بعض تہذیبی رویے اور ادبی روایات مختلف ہیں۔ ان تہذیبی رویوں اور ادبی روایات کی تفہیم ضروری ہے۔ ادب، صحافت اور روزمرہ کی ضرورتیں اس باہمی اشتراک کو اور قریب تر کرنا چاہتی ہیں۔ انھی ضرورتوں کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے یہ ذولسانی لغت دو جلدوں میں شائع کی ہے۔

اس لغت کی ترتیب و تدوین میں جن چیزوں کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے ان میں یونیورسٹیوں کے نصابات، قدیم دستاویزات، صحافتی زبان اور عام بول چال کے الفاظ شامل ہیں۔ الفاظ کے ماخذ کی تلاش میں عربی، فارسی اور سنسکرت الفاظ کی بنیاد تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دستیاب لغات کے الفاظ علاقائی بولیوں کے الفاظ، کبیر، جائسی، سور اور تلسی کے کلام کے الفاظ، محاورے اور کہاوتیں شامل ہیں۔ الفاظ کے معنی اور سیاق و سباق میں یہ کوشش بھی جھلکتی ہے کہ ان دو زبانوں کو کس طرح قریب تر لایا جاسکتا ہے۔ اس لغت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندی اندراجات کے معنی اردو میں دے کر انھیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں علامات و اعراب کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ متن کے تلفظ میں دشواری نہ ہو۔ الفاظ کے معنی ظاہر کرتے وقت بقول مرتب ان کے ''مترادفات لانے کی کوشش اور مترادفات نہ ہونے کی صورت میں ان کے سیاق و سباق کی وضاحت کی گئی ہے اور معنی کی ترتیب استعمال کے تناسب سے دی گئی ہے۔''

دو جلدوں پر مشتمل اس لغت میں تقریباً سوا لاکھ الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے چار ہزار محاورے اور کہاوتیں بھی ہیں۔ لغت کے ابتدائی صفحات میں کونسل کے ڈائرکٹر کا پیش لفظ ایک صفحے میں، دو صفحے میں فہرست، تین صفحے میں مرتب لغت کا دیباچہ اور چار صفحات میں لغت کے استعمال کے طریقے درج ہیں۔ استعمال کے طریقوں میں حروف کی ترتیب، ماخذ، الفاظ کی نقل، تصریف و اشتقاق، علامات اور مخففات، نحوی زمروں کی نشاندہی، ماخذ کی نشاندہی، صوتی شکلوں کی نشاندہی کے علاوہ چند اور وضاحتیں ہیں جو اس لغت کی غرض و غایت کا احاطہ کرتی ہیں۔ پہلی جلد 1575 صفحات کی ہے جس میں अ سے न کے الفاظ ہیں اور دوسری جلد 1576 سے 3268 صفحات تک ہے جس میں प سے ह کے اندراجات ہیں۔ دوسری جلد میں صفحہ 3174 سے آخر تک محاورے اور ضرب الامثال دیے گئے ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد خاں کی یہ کوشش خاطر خواہ پذیرائی کی مستحق ہے۔ طباعت اور بائنڈنگ بھی دیدہ زیب ہے۔

کلیات اسعد بدایونی

مرتب: رضوان الرضا رضوان

صفحات: 508، قیمت: -/250 روپئے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: نجمہ رحمانی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

گذشتہ کافی دنوں سے جدید غزل کی مقبولیت، عدم مقبولیت، لسانی مزاج اور موضوعات، حلقۂ شعر و ادب میں مسلسل موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ تحسین و تنقید اور عمل و ردعمل کے اس مستحسن سے جو فہرست ہمارے سامنے آئی ہے اُس میں اسعد بدایونی کا نام نمایاں ہے جن کی کلیات ابھی حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان سے شائع ہوئی ہے۔

اس کلیات میں ''دھوپ کنارہ'' (1977) سے ''جنوں کنارہ'' (1992) نیز 1997 میں ''نئی پرانی غزلیں'' کے عنوان سے دیوناگری رسم الخط میں شائع شدہ کلام بھی شامل ہے۔ آغاز میں پروفیسر اصغر عباس کا تاثراتی مضمون ''آؤ اسعد فسوں ساز کی بات کریں'' کے عنوان سے شامل ہے جو اسعد بدایونی کے علی گڑھ کے زمانے کی یادداشتوں پر رقم کیا گیا ہے۔

کلیات کی ترتیب میں گُل رنگیں، جنوں کنارہ اور داستانی غزلیں جیسے عنوانات قائم کرکے کلیات کو موضوعاتی خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ زمانی اعتبار سے کی گئی ترتیب میں ایک صورت یہ نکلتی ہے کہ قاری کے لیے شاعر کے ذہنی ارتقا کے مراحل کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے لیکن عام روش سے ہٹ کر موضوعاتی نقوش پروی گئی یہ ترتیب اس اعتبار سے مستحسن ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے الفاظ و تراکیب کا استعمال نیز شاعر کے فکری رویوں کا ایک واضح خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ مرتب اس ترتیب کی وضاحت پیش لفظ میں بھی کردیتے۔ آغاز میں اسعد بدایونی کے فکر و فن پر چند مضامین کی شمولیت سے کلیات کی قدر و قیمت دوچند ہوسکتی تھی۔

اسعد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں روایت سے وابستگی بلکہ اس کے لیے ان کی وارفتگی ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔ غالباً اسی نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترتیب میں عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں۔ یہ شاعری کلاسیکیت

سے جدیدیت تک اکثر رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اکثر مقامات پر تراکیب کا نیا پن قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے:

ابھی دریچۂ دل سے ہوا ہے کتنی دور
وہ لمسِ خواب وہ آواز پا ہے کتنی دور

مرے بدن کے فلک پر کئی ستارے ہیں
مگر یہ دل کے خلا کو پتا ہے یا مجھ کو

اس قسم کے اشعار میں جمالیاتی حسن کا رنگ دراصل 'بدن فلک' اور 'لمسِ خواب' جیسی تراکیب کے سبب کھلتا ہے لیکن تلاشِ ندرت کبھی کبھی شعر کو سپاٹ اور بے رنگ بھی کر دیتی ہے۔ یہ صورت موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر ایک ناہموار کھردرے پن کا احساس دلاتی ہے:

میں تخمِ اشک سے طوفاں اُگانے کی ضد میں
تمام شہر کو حیران کرتا رہتا ہوں

میں رزق کی آواز پہ لبیک کہوں گا
ہاں مجھ کو زمینوں سے محبت نہیں کوئی

عصری مسائل کو غزل کے سانچے میں ڈھالنا خاصا دقت طلب مرحلہ ہے۔ یہ کوشش کبھی کبھی شعری پیکر کی شکستگی کی وجہ بھی بن جاتی ہے۔ لیکن اسعد بدایونی کے یہاں یہ صورتحال دوسرے شعرا کے مقابلے کم کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسی کلاسیکی رچاؤ سے عبارت ہے جو عہدِ حاضر میں بھی غزل کا پسندیدہ رنگ ہے:

مرے لوگ خیمۂ صبر میں مرے شہر گردِ ملال میں
ابھی کتنا وقت ہے اے خدا ان اُداسیوں کے زوال میں

کبھی چشمِ شوق کے سامنے کوئی شے دھنک کی طرح کھنچی
کبھی دل کے دشت میں پھول سا کوئی کھل گیا جو بلا کا تھا

وہ جب ملا تو کسی رنجِ رائیگاں میں ملا
میں جب کھلا تو کسی شاخِ بے اماں پہ کھلا

مختصراً 508 صفحات پر مشتمل دھنک رنگ شاعری غزل کے قاری کی دل بستگی کے سامان کے ساتھ اردو کے شعری سرمایے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

کلیاتِ نگارشات وخطبات بابا بھیم راؤ امبیڈکر

صفحات: 640 (دو جلدیں)، قیمت: -/200 روپئے

ناشر: ڈاکٹر امبیڈکر فاؤنڈیشن

مبصر: عابد سہیل، 22۔ ایس۔ پی۔ جرنلسٹ کالونی، سیکٹر 'C'، علی گنج، لکھنؤ

کم وبیش ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ان دو جلدوں کا مطالعہ ہر اس شخص کو جسے ملک کے مسائل اور اس کے مستقبل سے دلچسپی ہو، ڈاکٹر امبیڈکر کی فکر کی توانائی، دوراندیشی، مسائل کی گہرائی تک پہنچنے اور ان کی تجزیہ کرنے کی صلاحیت پر حیران کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ملک کے وفاقی ڈھانچے، قانون کے مسائل، فرقہ واریت کے اسباب، زرعی اصلاحات، ذات پات کی تفریق کے وجوہ، ان سے نجات حاصل کرنے کے طریق کار اور لسانی صوبوں کی تشکیل وغیرہ پر ان کی نگارشات اور خطبات کے مطالعے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ان سے روشنی حاصل نہ کر کے ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا ہے۔ مقامِ افسوس یہ بھی ہے کہ ہمیں اس زیاں کا احساس بھی نہیں جس کا ہم نے بے معنی نعروں کو اپنانے، الجھنوں کو ان کا حل سمجھنے اور غیر مسائل (Non-issues) کو اصل مسائل سمجھنے کی غلطی کر کے خود کو مستوجب بنالیا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ آج سے ساٹھ ستر سال قبل ایک شخص نے ان دشوار امور پر جو آج تک ہمیں پریشان کر رہے ہیں، اعداد وشمار کی مدد سے اس قدر سائنسی ڈھنگ سے سوچا تھا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عملی تجاویز پیش کی تھیں، ضروری نہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی ان تجویزوں کو من وعن قبول کر لیا جائے، لیکن وہ طریق کار تو اختیار کیا ہی جاسکتا ہے جو ان خطبات اور نگارشات سے برآمد ہوتا ہے۔ یعنی معروضیت کو ہاتھ سے جانے نہ دینا اور مفروضات کا اسیر نہ ہونا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے فرقہ واریت کے زہر سے نجات حاصل کرنے کے لیے فکر کی جس سلامت روی پر زور دیا ہے وہ موجودہ حالات میں یادوں کے سہارے گایا ہوا ایک ایسا نغمہ معلوم ہوتا ہے جو سنائی بھی نہ دے رہا ہو۔ بابا صاحب اپنے عملی منصوبوں کی بنیاد نظریات پر ضرور رکھتے ہیں لیکن عملی پہلوؤں کو ان کا اسیر نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً فرقہ واریت کے مسئلے کے سلسلے میں وہ لیجسلیچر، حکومت اور انتظامیہ میں نمائندگی کے سوال پر غور وفکر کرتے ہوئے نمائندگی کے تناسب، حکومت کی نوعیت اور جگہیں بھرنے کے طریقوں تک پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

امبیڈکر کو افسوس تھا کہ ہم نئے پن کے بجائے قدامت پسندی، تجربہ کے بجائے باطنی آواز اور خوش پوشی کے بجائے کم پوشی کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ہندوستان کو ایک تازہ کار جمہوریت کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے اور باطنی اسرار ان کے فکری منظرنامے میں کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ بابا صاحب نے ملک کی دستور سازی میں قائدانہ کردار ضرور ادا کیا اور یہ ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ ان کی فکری وراثت پوری قوم اور پورے ملک تک منتقل نہیں ہوسکی۔ اور بحرِ زخار ایک آب جو میں محصور ہوکر رہ گیا، یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ اس کی دونوں جلدوں کا مطالعہ ہر اس شخص کو ضرور کرنا چاہیے جو ملک کے مستقبل سے متعلق خوابوں کو جن کی تعبیر کے لیے

جنگِ آزادی لڑی گئی تھی، حقیقت کی شکل دینا چاہتا ہے۔ لیکن صرف مطالعے اور اس سے پیدا ہونے والی فکر کی جوت پر قانع ہو جانا کافی نہ ہوگا، اس پر عمل بھی ضروری ہے۔

مکتوبات ساغر نظامی

مرتب: فیروز مظفر

صفحات: 272، قیمت: -/250 روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، نئی دہلی-2

مبصر: ڈاکٹر ممتاز الحق، ای-227، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی-110025

ساغر نظامی (1984-1905) اپنے عہد کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر تھے وہ بڑی رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے اور انھوں نے مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان کا تعلق صحافت اور کتابوں کی اشاعت سے بھی رہا، فلموں کے لیے انھوں نے گیت اور مکالمے بھی لکھے۔ آل انڈیا ریڈیو میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت ہند کے اقامتی شاعر کی حیثیت سے بھی انھوں نے اہم کام انجام دیے۔

''مکتوبات ساغر نظامی'' اسی کثیر الجہات شخصیت کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں اپنے زمانے کے مشاہیر ادب، سیاسی رہنماؤں، دوستوں اور عزیزوں کی رنگارنگ تصویریں نظر آتی ہیں اور ان کے ساتھ ساغر کے تعلقات کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ کھٹے میٹھے تجربات، ہدایات کا سخت لہجہ، کاروباری گفتگو کا انداز، پیار محبت کے سریلے نغمے غرض یہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ساغر نظامی کی شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان خطوط کے ذریعے ان کی شخصیت کے کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آتے ہیں جو ان کی دیگر تحریروں میں تمام و کمال نہیں آسکے تھے۔ مثلاً ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ان کے تعلقات، مشاعروں کے منتظمین کے ساتھ ان کے معاملات، پنڈت نہرو کے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت، ادیبوں اور شاعروں کی بے راہ روی کے لیے ان کی مذمت، جرأت اظہار کی مدافعت، مشاعروں میں عزت نفس برقرار رکھنے پر زور، ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے ان کے دل کو پہنچنے والی تکلیف وغیرہ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ ان خطوط میں ملتا ہے۔

مکتوبات کا یہ مجموعہ 1926 سے 1980 تک 108 افراد کو لکھے گئے 175 خطوط پر مشتمل ہے۔ اردو کے قارئین کی یہ خوش بختی ہے کہ ساغر نظامی نے کافی تعداد میں خطوط لکھے اور ان خطوط کا اصل مسودہ اپنی فائل میں محفوظ بھی رکھا اور ان کی اہلیہ نے بھی یہ ذمے داری بحسن و خوبی انجام دی۔ ان خطوط کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ان سے اس دور کے ایسے کئی واقعات اور اشخاص پر روشنی پڑتی ہے جن پر وقت کی دبیز تہیں جم چکی ہیں اور اب ان تک رسائی کے ہمارے پاس دوسرے ذرائع نہیں۔ بعض خطوط انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کرتے ہیں مرتب نے ان خطوط کو ترتیب دے کر ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

میری گفتگو تجھ سے

شاعر: مدحت الاختر

صفحات: 212، قیمت: -/225 روپے

ناشر: لائف ٹائمز پبلیکیشن، وویکا نند نگر، کامٹی-441002

مبصر: عبدالاحد ساز، 149 یوسف مہر علی روڈ، زکریا مسجد، چوتھا منزلہ، ممبئی-400003

ڈاکٹر مدحت الاختر کا شعری مجموعہ ''میری گفتگو تجھ سے'' ان کا دوسرا مجموعہ ہے جو ان کے پہلے مجموعے ''منافقوں میں روز و شب'' کے 24 سال بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔ اپنے پہلے ہی پڑاؤ پر انھوں نے ناقدین و قارئین کی اس قدر توجہ حاصل کر لی تھی کہ اس طویل وقفے کے باوجود صرف رسائل میں شائع ہوتی رہنے والی تخلیقات کی بنا پر نمائندہ معاصرین کے زمرے میں ان کی شناخت برقرار رہی۔ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے معتبر و مستند نقاد نے ان کی شاعری پر بڑے ارتکازِ نظر کے ساتھ مضمون لکھا ہے جو زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل ہے۔ مدحت الاختر کے گذشتہ اور حالیہ مجموعے کا موازنہ کرتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''مدحت الاختر کی افتادِ مزاج اور ذہنی ساخت تو اس مجموعے میں بھی ویسی ہے جیسی پچھلے مجموعے میں تھی، لیکن اب طنز کی شدت کی جگہ ایک ٹھہراؤ آگیا ہے۔ زمانے سے ان کی اب بھی ٹھنتی ہے لیکن اب وہ ہراساں نہیں ہوتے اب تلخی کی جگہ متانت ہے۔ طنز میں ایک طرح کی ہمدردی اور شگفتگی بھی شامل ہے اور برہمی میں پھٹ پڑنے والی کیفیت نہیں ہے۔''

مصنف کے ہم وطن و ہم عصر شاعر شاہد کبیر مرحوم کی یہ دیانتدارانہ رائے بھی اتنی ہی اہم ہے کہ:

''ناموافق حالات میں جدید لب و لہجے کی توانائی سے متاثر ہونے والے نئی نسل کے جو شعرا تنقید اور الزامات سے بے نیاز ہو کر اعتماد اور لگن کے ساتھ جدید غزل کی آرائش میں مصروف تھے، ان میں ایک نام مدحت الاختر بھی تھا۔'' (ملحوظ رہے کہ شاہد کبیر کا یہ بیان چھٹی دہائی کے حوالے سے جدید شاعری کے سیاق میں ہے۔)

شاہد کبیر کی اس رائے کی روشنی میں اگر ہم ''میری گفتگو تجھ سے'' کی غزلوں کو بغور پڑھیں تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان پر ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی کوئی اصطلاحی چھاپ نہیں ہے۔ ہاں یہ رجحانات و میلانات از

خود شاعر کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ بن کر تخلیقی سطح پر ضرور نمایاں ہوئے ہیں۔ ان میں روایت کی پاس داری اور التزام بھی ہے اور روایت سے انعطاف کی انفرادی ندرتیں بھی۔ مثلاً روایت سے مستفید ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اب بھی اسی درخت کے نیچے ملیں گے ہم
سایہ اگرچہ اس کا گھنا اب نہیں رہا

سرکشانِ عشق پھر آمادۂ فریاد ہیں
پھر کوئی فرمانِ قتلِ عام جاری کیجیے

کہتے ہی کہتے میر سے عاشق موئے ہزار
اب تک تو اس نے تیر کو سیدھا نہیں کیا

بر سرِ راہ تغافل تو نہیں دیکھی ہے
میری کھوئی ہوئی شے تم نے کہیں دیکھی ہے

اور ان کے موازنے میں اپروچ کی یہ ندرتیں بھی دیکھیے:

میری خطا یہ تھی کہ جدا دوسروں سے تھا
اس واسطے حنوط مجھے کردیا گیا

ہم اپنے گوشۂ غم دل کے رہے اسیر
چشمِ طلب سے سیرِ مضافات بھی نہ کی

جسم تیرے لمس کے پتھر تلے شل ہو چکا ہے
روح کو ہی اتنا بھاری بوجھ ڈھونا چاہیے تھا

کھلی جو آنکھ تو خوابوں کی بوند بھی نہ ملی
پیا تھا رات کو پانی اسی صراحی سے

ندرت ہی کے ضمن میں قرآن مجید کی "سورۂ یوسف" سے ماخوذ یہ تلمیح بھی ملاحظہ نظر ہو، جو شاید ہی اس سے پہلے غزل میں کسی شاعر نے استعمال کی ہو۔ کم از کم راقم الحروف کی دانست میں تو نہیں:

دیکھا ہے کوئی خواب عزیزانِ شہر نے
کے سال کا اناج ہے اے ہم شبیہِ من

دو مجموعوں کے درمیان کا عرصۂ ظاہرہ، شعور و فکر کے ارتفاع، مشاہدے اور تجربے کی توسیع اور احساس کے نکھار ہی سے عبارت رہا ہوگا۔ ذہن و دل کی بلوغت کے ان مراحل کو اظہار کی بلاغت کی شکل میں کئی اشعار میں پہچانا جاسکتا ہے جن میں خیال کی گہرائی اور رمزیت بھی ہے اور تزکیۂ نفس سے مملو دردمندی بھی

اپنا وجود بھی نظر آتا نہیں مجھے
کس دشت کا غبار تری رہگذر میں ہے

کم فرصتی سے پوری سمجھ میں نہ آسکی
دنیا ہمارے واسطے نیرنگ بھی نہیں

وسیع فکری تناظرات کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشرتی معاملات کی پیچیدگیاں، تعلقات کے نفسیاتی زیر و بم، جذبات کا زیاں، شدت احساس کی رائیگانی اور اس نوع کے کئی باریک پیچ و خم مدحت الاختر کے شعری اظہار کا شروع ہی سے حصہ رہے ہیں۔ یہ سلسلۂ گفتگو فہم و ادراک کی مزید نزاکتوں کے ساتھ اب بھی جاری ہے:

کرتے نہیں کسی کے گناہوں پہ تبصرہ
ہم اس معاملے میں بہت ہوشیار ہیں

کواڑوں پر نشاں کس نے لگائے رات بھر میں
بچا لوں جان، پھر معلوم بھی کرتا رہوں گا

عجیب لوگ ہیں، معلوم کرتے پھرتے ہیں
کہ میرے لب کا تبسم کہاں سے آیا ہے

جلد بازی میں نہیں ہوتے ہیں سچے فیصلے
کچھ تامل بھی پذیرائی میں کرنا چاہیے

کتاب میں چند غزلیں، ایک باب "مسلسل غزل" کا قائم کرکے شامل کی گئی ہیں۔ ان غزلوں میں موضوع یا جذبے کے اعتبار سے کچھ تواتر ضرور ہے۔ مثلاً ان میں عشق، ناکامی، حسرت، طلب، بے وفائی وغیرہ کا بیان نسبتاً زیادہ ہے، یا یہ کہ صیغۂ تکلم کا ایک التزام ہر غزل میں ہے یعنی واحد متکلم، مخاطب یا غائب مگر پھر بھی یہ غزلیں ایسی مسلسل نہیں ہیں کہ ان کے لیے ایک الگ باب قائم کرنا ضروری ہوتا۔ اسی طرح کچھ قدرے طویل ہم ردیف و ہم وزن غزلیں بھی قافیے کی تبدیلی کے ساتھ شامل ہیں۔ ان میں احساس و فکر کے زاویوں پر جوشِ اظہار اور قدرتِ بیان کے عناصر غالب ہو گئے ہیں۔ مثلاً دو ہم ردیف غزلوں کے دو دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کیوں اتنا بے قرار ہے اے ہم شبیہِ من
کس کا یہ انتظار ہے اے ہم شبیہِ من

دشوار ہے خروج طلسمِ خیال سے
یہ ذات کا حصار ہے اے ہم شبیہِ من

اور

کیوں اس قدر اداس ہے اے ہم شبیہِ من
سب کچھ تو تیرے پاس ہے اے ہم شبیہِ من

تیرا وجود پھیلی ہوئی داستان ہے
غم جس کا اقتباس ہے اے ہم شبیہِ من

اس سے قطعِ نظر چند چھوٹی بحروں کی غزلیں زیادہ اہم ہیں، جن کے بعض اشعار سہل ممتنع کی اچھی مثالیں بن گئے ہیں۔ جیسے:

رنگ آفاق میں بکھرتے ہیں
خواب کی تتلیاں اڑانے سے

لوٹ آیا سلامتی کے ساتھ
کیا کہا دشت نے دوانے سے

جاں نثار اختر نے کہا تھا

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط ان کو سنانے کے لیے ہیں

جس میں کچھ کی تخصیص پر اصرار ہے۔ اس کے برخلاف مدحت الاختر کہتے ہیں:

ہر ایک شعر میں ہے میری گفتگو تجھ سے
غزل کہوں تو کسی اور کو سنا نہ سکوں

ہر چند کہ ان کے کلام میں بچھڑ جانے والے محبوب سے جا بہ جا تخاطب ہے بھی، مگر "تجھ سے" کا زیادہ تر اطلاق ان کے اصل مخاطب یعنی قاری ہی پر ہوتا ہے۔ اس بامعنی شعری کاوش "میری گفتگو تجھ سے" کو عصری شاعری کے سنجیدہ و وابستہ قارئین یقیناً استحسان کے ساتھ قبول کریں گے۔

اردو غزل۔ انیسویں صدی کے تناظر میں

مصنف: ڈاکٹر جلال انجم

صفحات: 164، قیمت: -/200 روپئے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-2

مبصر: خسرو متین

ڈاکٹر جلال الدین کا نام اردو میں تحقیق و تنقید کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ "اردو غزل۔ انیسویں صدی کے تناظر میں" ان کی نئی کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں "قلق میرٹھی۔ حیات اور کارنامے"، "افکار تازہ" اور "امیر اللہ خاں شاہین۔ فن اور شخصیت" شائع ہو چکی ہیں۔ "قلق میرٹھی۔ حیات اور کارنامے" پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو انھوں نے ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کی زیر نگرانی قلم بند کیا تھا اور جس پر انھیں میرٹھ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔

زیر نظر کتاب کا موضوع بڑا وسیع ہے جسے ڈاکٹر جلال انجم نے دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعرا کو لے کر ایک مختصری کتاب میں سمیٹ لیا ہے۔ لیکن کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ کتاب کو سات ابواب میں منقسم کیا گیا ہے جن کے عنوانات ہیں:

انیسویں صدی کا سیاسی اور سماجی پس منظر، اردو شاعری کا اصلاحی دور، پہلا دور (1830 سے 1800)، اردو غزل کا عروج (عہد غالب)، اردو غزل کے مختلف اسالیب (1800-1870)، عزیز۔ ثاقب اور محشر کی شاعری، تلامذۂ غالب، اردو شاعری میں غالب کے اثرات۔ "پیش گفتار" کے تحت ڈاکٹر ابن کنول نے کتاب کے مشمولات پر گفتگو کی ہے۔ میں ان کی اس بات سے صد فی صد متفق ہوں۔ "اردو غزل۔ انیسویں صدی کے تناظر میں" ایک ایسی کتاب ہے جس میں پوری ایک صدی کے غزل کے نشیب و فراز کو دانشمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔"

بی اے اور ایم اے کے طلبہ اردو غزل پر مواد حاصل کرنے کے لیے اکثر پریشان رہتے ہیں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر جلال انجم کی یہ کتاب ان طلبہ کی پریشانی کو کافی حد تک دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ایک طالب علم کی جیب 200 روپئے کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے اس کی قیمت کچھ کم ہونی چاہیے تھی۔ صفحات کو سامنے رکھا جائے تو بھی قیمت واجبی سے زیادہ ہے کتاب اغلاط سے پاک اور دیدہ زیب ہے۔

● افسوس ہے کہ صاحبِ کتاب اور تبصرہ نگار دونوں ہی پچھلے دنوں انتقال کرگئے۔ ادارہ

□□□

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت و مقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس و تدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت -/66 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عبدالرحیم نشتر

یہیں مجھ کو جینا ہے

مجھے سب سے پیاری ہے میری زمیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

یہ پربت، یہ میدان، یہ وادیاں
یہ جنگل، یہ کہسار، یہ گھاٹیاں
سمٹنا یہیں ہے، بکھرنا یہیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

یہ ندیاں، یہ ساگر، یہ آبِ رواں
یہ بادل، یہ بارش، یہ پُروائیاں
مجھے موتیوں سا نکھرنا یہیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

یہ رنگ اور بو کے رسولوں کا دیس
رسیلے پھلوں اور پھولوں کا دیس
مہک بن کے دل میں اترنا یہیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

ہواؤں میں خوشبو لٹاتی بہار
یہ آکاش چھوتے پرندوں کی ڈار
یہیں ہے ٹھہرنا، گزرنا یہیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

محبت یہاں کی ہواؤں میں ہے
خلوص و وفا گاؤں گاؤں میں ہے
یہیں مجھ کو بننا، سنورنا یہیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

مرے خون سے ہے بہارِ چمن
میں قربان تجھ پر نگارِ وطن
نیا رنگ بن کے ابھرنا یہیں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

مجھے پیار اس کی فضاؤں سے ہے
مجھے پیار اس کی ہواؤں سے ہے
یہ میرا وطن ہے بہشت بریں
یہیں مجھ کو جینا ہے، مرنا یہیں

□□□

پتہ:
Saudabi Apartment, A-9,
Goregaon - Raigad-402103

قیصر سرمست

بکتر بند جانور

قدرت نے بعض جانوروں کو نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے لمبے پیر عطا کردیے تاکہ وہ بھاگ کر خود کو بچا سکیں۔ بعض جانوروں کو درختوں پر چڑھنے کی صلاحیت سے نواز دیا کہ وہ دشمنوں کی دست رس سے دور ہو جائیں اور کچھ جانوروں کو فضا میں اڑ کر یا زمین میں گھس کر اپنی جانوں کو محفوظ رکھنے کا گُر سکھا دیا۔ جانوروں کی ایک انوکھی قسم ایسی بھی ہے جسے زرہ پوش بنا دیا۔ ان زرہ پوش جانوروں کو ARMOUR ANIMALS کہتے ہیں۔

ایسے بکتر بند جانوروں کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں وقت کے پہیے کو پیچھے کی طرف گھمانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پیچھے بھی اتنا کہ خود ہم اپنے آپ کو اس زمانے میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں پا سکیں گے یعنی اتنا عرصہ پہلے کہ جب انسان پیدا نہیں ہوا تھا کرۂ ارض کا سارا ماحول یکساں تھا، مضمحل اور بے رونق سے سبز رنگ میں ڈوبا ہوا۔ ہر طرف بوجھل سبز رنگ بکھرا ہوا تھا۔ بے رونق کا تسلط تھا۔

آج تک ماقبل تاریخ کے جانوروں کو جو متحجر ڈھانچے (Fossils) ہمیں ملے ہیں ان کو پیش نظر رکھیں تو ''براکیوسارس'' (Brachiosaurus) سولہ کروڑ پچاس لاکھ سال پہلے افریقہ، کولوریڈو، اوکلاہوما اور یورپ میں پایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ''ڈپلوڈوکس'' (Diplodocus) اور ''برونٹوسارس'' (Brontosaurus) بھی وجود میں آچکے تھے۔ یہ تینوں ہی ڈائنوسارس انتہائی کیم شحیم اور اونچے پورے ہونے کے باوجود بہت امن پسند اور ساتھ ہی سبزی خور بھی تھے۔ اسی دور کی یادگار اور زرہ بکتر سے لیس ''اسٹیگوسارس'' (Stegosaurus) اور ''ٹریسے رے ٹوپ'' (Triceratop) ہیں۔ یہ دونوں جانور سر سے پیر تک سپروں (Scales) سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک کی پیٹھ پر مثلث نما تیز پلیٹوں کی دو قطاریں تھیں تو دوسرے کا تمام جسم بکتر بند تھا۔

یہ کم عقل اسی زعم میں اس دور کے سب سے بڑے اور بھیانک گوشت خور عفریت ''ٹائرانوسارس'' (Tyrannosaurus) سے بے خوف و خطر بھڑ جاتے اور اپنی جان گنوا دیتے تھے۔ ان دونوں ڈائنوسارس کی کھوپڑیوں میں دماغ نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ جو تھوڑی بہت عقل تھی وہ غذا کی تلاش میں صرف ہو جاتی تھی۔

اس دور کے بعد کے زمانے کی طرف قدم بڑھائیے۔ ہمارے اطراف وسیع و عریض سبزہ زار اور گھرے ہرے جنگل شاہ بلوط، بیچ اور چیڑ کے درختوں سے پٹے ملیں گے۔ ایسے پس منظر میں ہمیں دھندلی پہاڑیوں اور دھند میں لپٹے ہوئے درختوں کے سوا کوئی اور چیز نظر نہیں آتی۔ ہماری نظر کو روک لینے والی جو متحرک چیز ہے اسے ڈائنوسارس (یہ نام ''یونانی الفاظ "Terrible" اور Lizard سے بنا ہے) کہتے ہیں۔ یوں تو بیسیوں ڈائنوسارس ہمیں نظر آرہے ہیں لیکن ان میں سے ایک اپنی ہیئت اور سلاح بندی کی وجہ سے ہماری نظروں کو ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ

ہے Plated Lizard یا اسٹیگو سارس (Stegosaurus) یہ انتہائی وزنی اور جسیم جانور تھا جس کی پیٹھ پر ہڈیوں کی تختیاں نصب تھیں اور دم پر سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔ اس کا وزن تیس ہزار کلوگرام رہا ہوگا۔ لیکن اس کا سر چھوٹا تھا اور اس چھوٹے سے سر میں دماغ بھی بیحد چھوٹا تھا۔ یعنی صرف اڑھائی اونس۔ اسٹیگو سارس کا دماغ اس کے جسم کے مقابلے میں ایسا ہی تھا جیسے موجودہ ہاتھی کے سر میں مرغی کے انڈے کے برابر دماغ رکھ دیا گیا ہو۔ زرہ بکتر سے لیس ایک اور بھی جانور تھا جسے ماہرین نے ''ٹرائسیر ےٹوپ (Triceratop) کا نام دیا ہے۔ یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی بہ نسبت قد وقامت میں کم تھا لیکن بہت مضبوط اور خطرناک سینگوں سے لیس۔ یہ سینگ اس کے سر اور ناک پر پائے جاتے تھے جن کی تعداد تین ہوا کرتی تھی۔ اس کے ڈھانچے کو پیش نظر رکھ کر اس کی لمبائی کا اندازہ تیس پینتیس فٹ اور قد کا نوفٹ لگایا گیا ہے۔ اس کا سر بہت بڑا اور ڈھال جیسا تھا اور سر پر جو دو سینگ تھے وہ مشین گن کی نال جیسے تھے اور ان دونوں سینگوں سے چھوٹا ایک سینگ ناک پر تھا۔ ان سینگوں کی وجہ سے اس کا نام Triceratop پڑا۔ پچھلے دونوں سینگ اس کی آنکھوں کی بھی حفاظت کرتے تھے۔ ایک اور ڈائنوسارس تھا جسے Paleoscincus کہتے ہیں۔ اسے ایک اور نام سے بھی جانا جاتا تھا اور وہ نام ہے ''جنگجو مشین'' (Gighting Machine)۔ اسے یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مقابلے کے لیے کوئی دوسرا جانور کھڑا ہونے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا (سوائے ٹارانوسارس (King of Tyrants) کے جو گوشت خور تھا اور جس کے دانت خنجر سے زیادہ تیز تھے)۔

ماقبل تاریخ کے ان عفریتوں کے قصے کو مختصر کرکے موجودہ دور کے بکتر بند جانوروں کی طرف آتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے بکتر بند جانوروں میں قدرت نے بعض جانوروں کی سخت اور مضبوط چمڑے کی ڈھالوں کو فولاد میں بجھا کر ان کے جسموں پر مڑھ دیا ہے۔ ڈھالیں عطا کرنے کے باوجود ایک آدھ جانور کے جسم میں قدرت کو شاید کچھ کمی محسوس ہوئی تو ان کی ناک پر سینگ لگا دیے۔ (بعض گینڈوں کی ناک کے اوپر دو سینگ ہوتے ہیں۔)

ساری دنیا میں گینڈوں کی صرف پانچ قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان پانچوں قسموں کو براعظم ایشیا اور افریقہ نے آپس میں بانٹ کر دوسرے براعظموں کو گینڈوں سے محروم رکھا ہے۔

گینڈے کی کھال دوسرے کھپٹے دار جانوروں کے مقابلے میں بڑی نرالی ہوتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی جانور کی کھال نہ تو گینڈے کی کھال کی طرح دبیز ہوتی ہے اور نہ ہی جسم سے الگ ہوتی ہے۔ یہ کھال اسے خاردار جھاڑیوں سے محفوظ رکھتی ہے لیکن مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے اس کے جسم کی قدرتی ''جھولداریوں'' میں گھس کر اسے بے چین کر دیتے ہیں۔ قدرت نے اس بے چینی سے نجات پانے کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ ایک قسم کے پرندے اس کی کھال کی جھولداریوں میں سے ان کیڑوں کو چن چن کر کھا جاتے ہیں۔

اب چلتے ہیں زرہ بکتر سے لیس اس جانور کی طرف جو ہمارے ملک کے علاوہ چین، افریقہ وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسے شبینہ (Noctumal) جانوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس جانور کے سارے جسم (سر سے پیر اور دم تک) کانٹوں جیسے فلس (Scales) ہوتے ہیں اور یہ فلس ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں یعنی (Overlap) ہوتے ہیں۔ یہ جانور ہے پنگولن (Pangolin) (پنگوئن Penguin نہیں، پنگولن پستانیہ (Mammal) جانور ہے اور پنگوئن بغیر اڑنے والے پرندہ Flight Less Birds ہے)۔ یہ دن بھر کسی درخت کے کھوکھلے حصے میں کسی

کھو میں سانپ کی طرح کنڈلی جیسا اپنے جسم کو گول موڑ کر سوتا رہتا ہے۔ پنگولن اپنے جسم سے ایک قسم کا مادہ (Liquid) خارج کرتا رہتا ہے جو نہ صرف اسے دشمنوں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ جنس مخالف کو راغب کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ پنگولن اپنے مضبوط اور طاقتور پنجوں سے گرے ہوئے درختوں کے تنوں کا جگر چاک کر کے یا دھرتی کا سینہ چیر کر دیمک اور چیونٹیوں کو وہاں بھی پناہ لینے نہیں دیتا اور انھیں اپنی چپچپی زبان کے ذریعے پیٹ کی آگ میں جھونک دیتا ہے۔ مادہ پنگولن اپنے چھوٹے بچے کو پیٹھ پر یا دم پر بٹھائے پھرتی ہے۔

ایک اور رینگنے والا بکتر بند زبردست جانور ہے مگرمچھ، جسے انگریزی میں Crocodile اور فارسی میں نہنگ کہتے ہیں۔ مگرمچھ کا شمار رینگنے والے جانوروں کے تیسرے اور اہم گروہ میں ہوتا ہے۔ رینگنے والے تمام جانوروں میں یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ مانے جاتے ہیں کیونکہ اعلیٰ فقری (Vertebrate) جانوروں کے دل کی طرح ان کے دل بھی چار خانوں (Four Chambers) میں منقسم ہوتے ہیں اور تین خانوں والے دل رکھنے والے ریپٹائل (Reptile) کے دل سے کہیں زیادہ عمدگی سے خون کی سپلائی کرتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت مگرمچھوں کی چار اہم اور پچیس (تقریباً) ذیلی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن سب کے جسم سخت چمڑے کے زرہ بکتر سے ڈھکے ہوئے رہتے ہیں۔ دم پر سخت ترین پلیٹوں کی دو قطاریں دشمنوں کو مقابلے کے لیے للکارتی ہیں۔ اس کی دم لانبی، وزنی اور بے حد طاقتور ہوتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ آدم خور بھی ہوتے ہیں۔ مگرمچھ، GNU جیسے قوی ہیکل چوپائے کی تکہ بوٹی الگ کر دیتے ہیں (لیکن پانی کے اندر) اس کے جسم کا اوپری حصہ گہرا ابھورا ہوتا ہے جس پر سیاہ دھبے ہوتے ہیں۔

کچھوے Tortoises:۔ رینگنے والے جانوروں کی اس مشہور ترین ہستی کی تین قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ ماہرین حیوانات ٹرٹواس Tortoise اور ٹارٹل Turtles میں یہ فرق بتاتے ہیں کہ ٹارٹل پانی میں رہتے ہیں ٹرٹواس زمین پر رہ کر گزارہ کرتے ہیں لیکن انھیں تیرنا بھی بہت اچھا آتا ہے۔ ان کے پاؤں ہوتے ہیں اور زیادہ تر ٹارٹل چپوؤں (Paddles) کے مالک ہوتے ہیں۔

کچھوؤں کی ایک سو چالیس قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ تمام قسمیں منطقہ حارہ (خط سرطان اور خط جدی کا درمیانی علاقہ) اور معتدل علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔

یونانی کچھوا Greek Tortoise:۔ اس کچھوے کی محرابی ڈھال پر نکیلی پلیٹیں ہوتی ہیں۔ اس کی کالی ڈھال کے کنارے زرد رنگ کے ہوتے ہیں اور مادہ کی دم کے سرے پر نکیلے مہمیز لگے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اور سری لنکا میں پائے جانے والے ستاریڈ کچھوے (Starredtortoise) کی ڈھال بھی سیاہ ہوتی ہے اور درمیان میں پیلی دھاریاں چمکتی ہوئی بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کی ڈھال پر بنی پلیٹوں کا ابھار بھی بڑھتا جاتا ہے۔

سب سے بڑا کچھوا:۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا کچھوا ''گلاپوگس دیو کچھوا'' Galapegos Giant Tortoise ہے۔ اس کی ڈھال 58 انچ یعنی تقریباً پانچ فٹ چوڑی ہوتی ہے۔ اس کی ڈھال پر ایک آدمی بیٹھ جائے تو کچھوا اسے اٹھائے پھر سکتا ہے۔ سمندری کچھوؤں میں سب سے بڑا چرمی کچھوا Leathery Turtle ہوتا ہے۔

کسی زمانے میں ''ہاک بل کچھوا Hawk Bill Turtle سب سے زیادہ بدنصیب اور مظلوم کچھوا ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی ڈھال کے

حصول کے لیے لوگ اتنا ظالمانہ طریقہ اپناتے تھے کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس بدنصیب کی ڈھال کو اس قدر گرم کرتے تھے کہ وہ بیچارہ جان بچانے کے لیے ڈھال کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ کچھ ہی دن بعد دوسری ڈھال آتو جاتی تھی لیکن اس قدر مضبوط اور ٹھوس نہیں ہوتی تھی۔ کچھوؤں کی ڈھال اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ وہ اپنا سر اور پیر اندر کرلیں تو ہرنی Lioness بھی ان کا بال بیکا نہیں کرسکتی۔

ایک ایسے بکتر بند جانور کے بارے میں سنیے جو ہمارے ملک میں نہیں پایا جاتا، یہ ہے ''ارماڈلو'' (Armadillo)۔ یہ صرف امریکا اور اس کے ذیلی ملکوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی صرف چار قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی اہم خصوصیت اس کے دانتوں کی تعداد ہے۔ اتنے زیادہ دانت شاید ہی کسی زمینی جانور کے منہ میں پائے جاتے ہوں، یعنی چھیانوے سے ایک سو چار تک۔

ارماڈلو کے بھٹ عموماً ساڑھے تین فٹ گہرے اور پندرہ فٹ لانبے ہوتے ہیں۔ دن بھر انھی بھٹوں میں یہ پڑے رہتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں بھٹوں سے نکل کر پیٹوں میں اجالے کا سامان کرتے ہیں۔ یہ اس کی اہم غذا دیمک، حشرات، ان کے لاروے اور چھوٹے جانور ہیں لیکن میٹھے، رسیلے پھل مل جائیں تو منہ نہیں موڑتے۔ پیدائش کے وقت ان کے بچوں کی زرہ ملائم ہوتی ہے لیکن چند ہی ہفتوں میں سخت ہونے لگتی ہے۔ نر ارماڈلو بڑے خودغرض ہوتے ہیں۔ صرف ملاپ کے زمانے میں ماداؤں سے دوستی گانٹھتے ہیں۔ غرض نکلنے کے بعد پھر پلٹ کر نہیں پوچھتے۔ انھیں چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم: بڑا ارماڈلو (Giant Armadillo) ہے اس کا جسم ایک گز لمبا ہوتا ہے (دم کی لمبائی اس میں شامل نہیں ہے) اور وزن سو پونڈ سے زیادہ۔ اس قسم کے ارماڈلو زیادہ تر ''پیراگوئے'' (Paraguay) میں پائے جاتے ہیں۔ تین حلقوں والا ارماڈلو (Three-Banded Armadillo) اپنے جسم کو مکمل طور پر گیند کی طرح موڑ (Rool) سکتا ہے۔ جب یہ گیند بن جاتا ہے تو کوئی بھی درندہ اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔

آخر میں زرّہ بکتر سے لیس ایک اور جاندار ہے جو نہ تو ریڑھ کی ہڈی والا (Vertebrae) ہے اور نہ ہی بغیر ریڑھ کی ہڈی والا (Inveryebrae) ہے۔ بلکہ یہ ایسے جاندار ہیں جن کی ہڈی جسم کے اندر رہنے کے بجائے جسم کے اطراف ایک خول (Cover یا case) کی صورت میں چڑھی رہتی ہے جسے بیرونی ڈھانچہ (Exoskeleton یا External Skeleton) کہتے ہیں۔ اس قسم میں مرجان، سیپ اور کیکڑے وغیرہ آتے ہیں۔ کیکڑوں کے ملائم جسم پر ہڈی جیسا سخت اور مضبوط خول چڑھا رہتا ہے۔ کیکڑا جب انڈے میں سے نکلتا ہے تو گوشت کا ایک حقیر اور کمزور لوتھڑا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے پیر، پنجے وغیرہ کچھ نہیں ہوتے۔ گوشت کا یہ لوتھڑا رفتہ رفتہ اپنی ہیئت بدلنے لگتا ہے یعنی سخت پنجے، ڈھال جیسی پیٹھ اور دندانے دار منہ نکلنے لگتے ہیں اور پھر وہ تمام ہتھیاروں سے لیس ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اسے یہ مضبوط خول چھوڑنا پڑتا ہے کیونکہ گوشت کے لوتھڑے کی سائز بڑھ کر اس میں پھنسنے لگتی ہے۔ اگر وہ خول بدلی نہ کرے تو گھٹ کر ختم ہو جائے، کیکڑوں کی بے شمار قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔

□□□

Kashana-e-Suriya, 17-3-516/1/N,
Yaqutpura, Hyderabad-23

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
19	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
20	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
21	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
22	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
23	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
24	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
25	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
26	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
27	انسانی ارتقا	70.00	18.00
28	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

29	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	3400.00	850.00
30	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
31	جنت سنگار	180.00	45.00
32	کلیات پریم چند (جلد 1 تا24)	4071	1018.00
33	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
34	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم) لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	387.00	97.00
35	مجموعہ نغز	268.00	67.00
36	مسدود راہیں	126.00	32.00
37	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
38	مولیئر	57.00	14.00
39	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
40	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
41	پشکن	60.00	15.00
42	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
43	قدیم ہندوستان میں شودر	82.00	21.00
44	قومی زبان	76.00	19.00
45	قواعد کیٹلاگ سازی	268.00	67.00
46	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
47	سیر کہسار	167.00	42.00
48	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
49	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
50	تنقید عقل محض	158.00	40.00
51	تاریخ طبی (جلد۔1)	43.00	11.00
52	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
53	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
54	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
55	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
56	تالستائے	46.00	11.00
57	اصول معاشیات	47.00	12.00
58	اترپردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
59	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت	118.00	30.00
60	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
61	وضاحتی کتابیات (جلد1، 3-22)	2650.00	663.00

62	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
63	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
64	عکس اور بر عکس	128.00	32.00
65	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
66	بھارت2004	250.00	63.00
67	دھوپ چولھا	38.00	10.00
68	اجارہ	131.00	33.00
69	فسانۂ آزاد جلد 1 تا4	1163.00	291.00
70	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
71	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
72	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
73	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
74	ارتقائے کائنات انسان ودیگر مضامین	94.00	24.00
75	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
76	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
77	کائنات جلیل	80.00	20.00
78	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
79	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
80	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
81	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
82	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
83	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
84	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
85	شہیدان آزادی (جلد اول ودوم)	213.00	53.00
86	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
87	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
88	سخنوران گجرات	77.00	19.00
89	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
90	تاریخ آصفی	58.00	15.00
91	اجرتیں	95.00	24.00
92	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
93	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2009 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

آبشار اور آتش فشاں

مصنف: فضیل جعفری

فضیل جعفری ہمارے عہد کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ "آبشار اور آتش فشاں" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 11 مضامین شامل ہیں۔ یہ تنقیدی تحریریں ادب پاروں پر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تنقیدوں اور نقادوں پر ہیں۔ اردو کی تنقیدی تاریخ میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور ان میں مزید تشخص اور دلائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث کی تفہیم میں فضیل جعفری کی کتاب قاری کے ذہن کو نئی روشنی عطا کرتی ہے۔

صفحات: 368، قیمت: -/160 روپے

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد دوم)

مرتب: وارث علوی

راجندر سنگھ بیدی اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی تحریروں نے قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ "کلیات راجندر سنگھ بیدی" کی اس دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے "بے جان چیزیں" اور "سات کھیل" جن میں 11 ڈرامے ہیں، ان کے 29 مضامین جن میں انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات اور تنقیدیں ہیں اس کے علاوہ مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں جو اس کلیات میں شامل ہیں۔ بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون عمدہ ہے جو ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/380 روپے

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ بھی تھا، جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/13 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت: -/285 روپے

دکنی لغت

مرتب: سیّدہ جعفر

دکنی شعر وادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے، جو اردو زبان وادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین وترتیب میں شمس الرحمن فاروقی، مغنی تبسم اور محمد نسیم الدین فریس جیسی شخصیات سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت: -/590 روپے

آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)

مرتبین — شمیم حنفی، مظہر مہدی

"آزادی کے بعد اردو نظم" آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ وتراکیب کے معنی بھی دے دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات: 758، قیمت: -/384 روپے

آزادی کی نظمیں

مرتب: سبط حسن

آزادی کی جدوجہد سے متعلق اردو ادب کی اشاعت قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کے تحت جاری ہے۔ "آزادی کی نظمیں" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار، دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں مرحوم رفیع احمد قدوائی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی لیکن حکومت نے اسے ضبط کرلیا تھا۔ یہ مجموعہ محض نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ جدوجہد آزادی کی تاریخ بھی ہے۔ کتاب میں غالب، آزاد اور حالی سے لے کر اکبرالٰہ آبادی، رضا نقوی واہی اور علی سردار جعفری تک 38 شعرا کی نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت اور بازار میں عدم دستیابی کے پیش نظر کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 143، قیمت: -/80 روپے

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

"مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت" میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

Date of Publication : 24/11/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, December 2008, Vol. 10, Issue: 12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

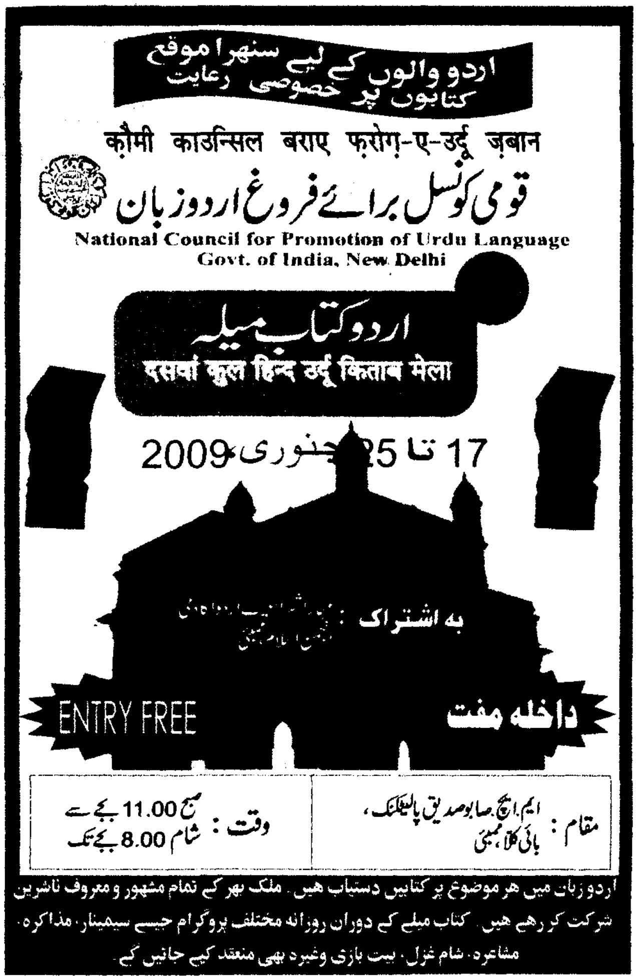

Printed and Published by Dr. AliJaved, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by Khanna Paper Mills Pvt. Ltd., Amritsar Editor: Dr. Ali Javed, Tel: 26103381, 26103938